دل دریا
شرون کمار ورما
نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

دل دریا

شرون کمار ورما

نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۔110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۔202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

پہلی بار دسمبر ۱۹۸۶ء   تعداد: 750   قیمت -/125 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

فہرست

اَب اُنھیں ڈھونڈ...

رجنی ایک مجسّم سوال ہے —— گندی، غربت زدہ، سسکتی ہوئی، بے غیرت بے ہنگم بستیوں کی بساندھ میں گندھا ہوا سوال!

رجنی کا محبوب —— ایک معزز، سماجی رتبہ یافتہ، شریف اور صاف ستھرا نوجوان ہے —— لیکن رجنی صرف اپنے محبوب کے لیے ہی نہیں، خود اپنے لیے بھی ایک سوال، ایک مسئلہ ہے۔ رجنی کا محبوب چاہتا ہے کہ وہ isolate ہوکر اپنے ماحول کو تج کر معزز بن جائے۔ سماجی رتبہ اور اطمینان و آسودگی حاصل کرے۔ لیکن رجنی اپنے سوالوں کے گرداب سے، کبھی باقی رہ جانے والی زندگی کی طرح بچ کر نکلنا پسند نہیں کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

> "میرے وہاں سے نکل آنے سے کیا پرابلم ختم ہو جائے گا؟ وہ ماحول، وہ حالات بدل جائیں گے۔ وہ گندی گلیاں، ٹوٹے ہوئے پرنالے، چڑچڑی عورتیں، زندگی سے اکتائے ہوئے لوگ بدل جائیں گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کیا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا... ہو ہی نہیں سکتا... میں تو ایک بہت بڑے پرابلم کا معمولی سا حصہ ہوں..."

رجنی کا کردار ایک مسئلہ کا Realisation ہے۔ وہ مسئلے کو، عناصر میں منقسم کرنا نہیں چاہتی۔ وہ اپنے کردار کو اپنے طبقہ اور اپنے ماحول کے کینوس سے الگ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ کسی بھی مکمل تصویر سے کسی ایک عنصر کی علاحدگی، نہ صرف اس عنصر کے وجود کو بے معنی

بنا دیتی ہے، بلکہ اصل کینوس کو بھی داغدار بنا دیتی ہے۔

رجنی میں ارادے کی قوت ہے، طبقاتی احساس ہے اور اس احساس سے فرار کی بجائے involvement کی جستجو ہے ——— رجنی ایک ایسی باغی عورت کا روپ ہے، جو زندگی کی جدّوجہد میں عارضی اور انفرادی سودے بازی سے انحراف کرتی ہے۔

اس انحراف کے بعد رجنی ایک اجنبی بن کر نمایاں ہوتی ہے:

"میں رجنی نہیں ہوں، آپ کو دھوکا ہوا ہے..."

"میں وہ لڑکی نہیں ہوں، جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں..."

رجنی کا ایک اور روپ، اجنبیت اور شناخت کے درمیان ہم رشتگی کا روپ ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب وہ اپنے محبوب کے رویے میں، حق کے احساس کی تشکیل کو جنم لیتے ہوئے دیکھ لیتی ہے:

"آج میں کتنی خوش ہوں، تم اندازہ نہیں لگا سکتے... پہلی بار تم نے مجھ پر اپنا حق سمجھا ہے۔ پہلے تم ڈرتے رہے، کتراتے رہے۔ میں مدتوں سے تمھاری تھی لیکن تم نے کبھی اپنا حق ہی نہیں جتایا..."

رجنی کا آخری روپ زندگی کا وہ لمحہ ہے، جب وہ خون تھوکتے ہوئے ایک تاریک کوٹھری میں دم توڑ دیتی ہے۔ یہ تاریکی اور خون کے چھینٹے، آنے والے زمانے کی رجنی کے لیے کوئی ورثہ چھوڑ گئے ہیں ——— شاید اسی لیے رجنی کے محبوب کو آنے والے زمانے کا انتظار ہے۔

محمود ہاشمی

جُوہُو سی بیچ پر ابھی ابھی اُس سے ملاقات ہوئی ہے، جسے ملاقات بھی نہیں کہا جا سکتا۔

وہ کھڑی سمندر میں گُھلتے سورج کو دیکھ رہی تھی اور سمندر ہی کی طرح گمبھیر اور شانت نظر آ رہی تھی۔ ایک شریر لہر اُس کے پاؤں بھگو کر لَوٹ گئی تھی اور اُس کے پیر کے پاس ایک گلابی سیپی چھوڑ گئی تھی۔ قریب ہی گھروندا بنانے والی بچّی، فراک جھاڑ کر، اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُس نے وہ سیپی اُٹھا کر بچّی کو دے دی۔

تب سمندر سورج کو پی چکا تھا اور شام کا سُرمئی آنچل دُور تک لہرا رہا تھا۔ سمندر پر سے آنے والی نمکین ہوا پام کی چھتریوں سے اُلجھ رہی تھی اور 'سی بیچ کلب' کا شور، موسیقی، قہقہے، مدّھم مدّھم وہاں تک پہنچ رہے تھے اور زرد روشنی کی بیمار سی شعاعیں اُس کے پاؤں چھُو رہی تھیں۔

میں نے سورج کی طرف دیکھ کر سوچا... 'کون ڈوب رہا ہے'، میں کہ وہ!

مَیں اُس سمے اُس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ سانولا رنگ گہرا گیا تھا، پتلی گردن، رُوکھے بال، رگیں پھولی ہوئی، شانوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، گہرے ہرے رنگ کی سوتی دھوتی، پیروں میں چپّل اور شانے سے لٹکتا ہوا تھیلا۔

"ر..." میری آواز بھی ڈوب گئی تھی۔

آج سے چھ سال پہلے ——— شاید چھ سو سال پہلے، یہ مغرور، ابھیمانی لڑکی میرے کمرے سے آندھی کی طرح نکل گئی تھی۔ سب کچھ تباہ کر کے، میری آواز اُس کے سینڈل کی کھٹ کھٹ سے ٹکرا کر لہولہان ہو گئی تھی اور میری دی ہوئی 'گیتانجلی' میز پر پڑی تھی، کسی لاوارث لاش کی طرح۔ اور جب مَیں اُس کی ماں کی اچانک موت پر افسوس کرنے گیا تھا تو اُس نے مجھے رسماً آنے والوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ سب کے جانے کے بعد بھی مَیں دیوار سے لگا بیٹھا رہا۔ دیوار کی بدبودار سیلن آہستہ آہستہ میرے جسم میں اُتر رہی تھی اور مجھے اپنا خون، اپنا انگ انگ جمتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ کمرے کا نیم اندھیرا میرے حواس پر چھایا چلا جا رہا تھا، لیکن میں بیٹھا رہا۔ وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اُس کا بھائی چائے کے لیے پوچھنے آیا۔ میں چُپ چاپ لوٹ آیا اور پھر وہ مجھ سے ملے بغیر، مجھے بتائے بِنا شہر ہی چھوڑ گئی۔

آج وہ اچانک دکھائی دے گئی تھی۔ اس مہانگر میں کب کس سے ملنے کی اُمید ہوتی ہے، یہاں تو آدمی خود سے بھی کبھی کبھی مِل پاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا، بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لوں، بھیگی ریت پر اُس کے ساتھ ٹہلوں، خالی سیپیاں

اکٹھی کروں اور اُس سے لپٹ کر اتنا روؤں، اتنا روؤں کہ سمندر حیرت سے دیکھتا رہ جائے —— تبھی وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئی —— سمندر کی طرف۔

میں کھڑا اپنے آپ سے لڑ رہا تھا، اُلجھ رہا تھا، کہ وہ ایک دم پلٹی۔ ہماری نگاہیں پل بھر کو ملیں، اُس کی گہری، اُداس آنکھوں میں پہچان جگنو بن کر چمکی اور بُجھ گئی۔ وہ گھوم کر دوسری طرف کو چل دی۔ اُس نے جیسے کچھ کہا تھا۔ شاید وہ میرا نام ہو۔

"رجنی۔"

وہ رُکی نہیں۔ میں لپک کر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ اُس نے میرا نوٹس نہیں لیا۔

"پہچانا نہیں مجھے!"

وہ خاموش چلتی رہی۔ اُس کا چہرہ پھیکا، بُجھا بُجھا اور خالی تھا، جیسے پانی میں بھیگے ہوئے کاغذ پر کی تحریر۔ آنکھوں میں وہی درد، وہی غم کی سیاہ پرچھائیاں تیر رہی تھیں، وہی ویران مندروں کا مقدس سنّاٹا، جس کے بغیر اس کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی تھی۔

"میں شرد ہوں۔"

"ضرور ہوں گے۔"

"سرلا کا بھائی۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"رجنی —— تم!"

"میں رجنی نہیں ہوں، آپ کو دھوکا ہوا ہے۔" اُس کا لہجہ نپا تُلا، لوہے کی طرح سخت اور ٹھنڈا تھا۔ اُس کی آواز میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں تھا۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا ——" میرے لہجے میں شکایت سے زیادہ طنز تھا۔

"میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" میرا لہجہ تیز اور درشت ہونے لگا تھا۔

وہ ٹھہر گئی۔ اُس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی:

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"میری تو ٹھیک ہے تمھا . . ." میں نے سوچا گر ما گرمی سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ شروع ہی سے اڑیل اور ضدی ہے۔ اس لیے نرمی سے کہا، "جھوٹ کب سے بولنے لگیں۔ جھوٹ سے تو تمھیں چڑ تھی۔ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر سکتی ہو۔ میں چپ چاپ چلا جاؤں گا، صرف ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے اور تمھیں آموں کے باغ کے کونے والا وہ ویران مندر، وہ نہر کی پٹڑی جس پر جامن کے پیڑ، گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سائے سوئے رہتے تھے اور ریلوے لائن کے پار لال حویلی کی شکستہ سیڑھیاں بھی یاد ہیں، جن پر ہم گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے تھے۔"

"عجیب آدمی ہیں آپ۔" وہ ہنس دی، "کسی لڑکی سے بات شروع کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ اگر یہ کسی فلم کے ڈائیلاگ ہیں تو اپنا ٹیلنٹ یہاں مت ضایع کیجیے۔"

"نہیں، اب کسی لڑکی سے یوں بات کرنے کا شوق ہے نہ ضرورت —— ایک ہی نے دُنیا بدل دی ہے۔"

"بہت خوب۔ لیکن مَیں وہ لڑکی نہیں ہوں، جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"رجنی، یہ مَیں ابھی طرح جانتا ہوں کہ تم ایک ضدی لڑکی ہو، لیکن تمھاری یہ ضد بے بنیاد اور بیکار ہے۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں ہونے والا۔ تم زبان سے چاہے جتنا جھوٹ بولو، ان آنکھوں کا کیا کرو گی، جو کبھی تمھارے بس میں نہیں رہیں، یہ آج بھی تمھارا بھید کھولے دے رہی ہیں۔"

"آپ بھاشن اچھا دے لیتے ہیں۔ دیکھیے مسٹر، نہ تو میں جھوٹ بول رہی ہوں اور نہ میرا کوئی بھید ہے۔ میں بالکل نارمل ہوں، آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ نہ تو میں آپ کو جانتی ہوں اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"اگر نہ چھوڑوں تو۔"

"تو . . ." اس نے ٹھنڈی نگاہوں سے میری طرف دیکھا —— "یہ بمبئی ہے اور ——"

"رجنی . . . !"

"مجھے دھمکایئے مت ——" سچ مچ بھڑک اُٹھی۔

کچھ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک آیا پرام سنبھالے، رجنی کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی، جیسے اُسے اپنی پناہ میں لے رہی ہو۔ لانگ والی دھوتی باندھے، کمر سے بھاری وہ عورت مجھے گھور رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کا ایک شخص اپنے بُل ٹیریئر کی زنجیر تھامے آگے آگیا تھا۔

"اے مسٹر، کیوں تنگ کر رہے ہو انھیں۔" وہ اپنے کتے سے بھی زیادہ خطرناک بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"معاف کیجیے محترمہ، مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہو گئی۔ سوری۔"

مَیں کسی گھائل آبی پرندے کی طرح اپنی کار کے اسٹیرنگ پر جا گرا۔ مجھے کسی قسم کی کڑواہٹ یا ناراضگی کا احساس نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں وہ ویران مکان ہوں جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ ٹوٹ چکے ہیں اور ہوائیں اس میں سے شور مچاتی گزر رہی ہیں اور کڑیوں سے لٹکی چمگادڑیں متواتر چیخ رہی ہیں۔ دوسرے پل لگتا کہ سمندر کا پانی میرے اندر بھرتا جا رہا ہے اور میں ابھی قے کر دوں گا۔

مَیں نے کار اسٹارٹ کی اور دھیرے دھیرے ڈرائیو کرنے لگا۔

پیچھے سے آنے والی کار زور زور سے ہارن بجا رہی تھی۔ مَیں نے اُسے راستہ دیا۔ میرے برابر آکر جیسے اسے آہستہ کر لیا گیا۔ رجنی اس کتے والے شخص کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور کتا پچھلی کھڑکی سے تھوتھنی نکالے ہوا میں کچھ سونگھ رہا تھا۔ مَیں نے کار روک لی، سگار سلگایا اور اس بڑی کار کو آگے جاتے دیکھتا رہا۔

اگلے موڑ پر رجنی مجھے پیدل جاتی نظر آگئی۔ پیچھے سے آنے والی بس کا ہارن سُن کر وہ اگلے اسٹاپ کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے بس کو اس وقت تک آگے نہیں نکلنے دیا جب تک کہ رجنی اسٹاپ پر نہیں پہنچ گئی اس کے لیے مجھے کنڈکٹر کی گالی بھی سُننی پڑی۔

○

رجنی! میں اس وقت اپنے فلیٹ کی ٹیرس پر کھڑا شہر کی روشنیوں کو دیکھ رہا ہوں اور بیئر پی رہا ہوں۔ سامنے سمندر ہے جو رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ خوبصورت اور بھیانک لگ رہا ہے، بالکل میری زندگی کی طرح۔ سمندر کے ساتھ ساتھ جو سڑک کی قوس ہے، روشنی میں نہائی ہوئی ہے، وہ چوڑی مضبوط دیوار، جو غصیلے سمندر کو روکے ہوئے ہے، اپنے کاندھوں پر بمبئی کے تھکے ہارے لوگوں کا بوجھ اٹھائے ہے۔ کوئی اکیلا ہے جو سمندر کو دیکھ رہا ہے، کوئی کسی کے ساتھ ہے، جنھیں سمندر دیکھ رہا ہے۔

پولیس والا گشت پر آگیا ہے، میں نے بیئر کا دوسرا گلاس بھی ختم کرلیا ہے، لوگ دھیرے دھیرے جا رہے ہیں۔ ٹریفک بھی کم ہوتا جا رہا ہے، صرف سمندر کا شور رہ گیا ہے۔ میں نے آج پہلی مرتبہ سمندر کو اتنے قریب سے اور صاف سُنا ہے۔

میں کمرے میں آگیا ہوں اور اب تمھاری تصویر دیکھ رہا ہوں، میز پر، ٹیبل لیمپ کی روشنی میں گیتا نجلی کھلی پڑی ہے، اس کے اوراق میں تمھارے بدن کی مہک ہے، تمھاری انگلیوں کا روشن لمس ہے۔ میں ہر رات سونے سے پہلے یہ کتاب پڑھتا ہوں، اچانک آنکھ کھل جائے تو بھی پڑھنے لگتا ہوں۔ تم نے ایک جگہ سُرخ پینسل سے نشان لگا رکھا ہے۔ شاید آج تم ان سطروں کو بھول چکی ہو، اُس گیت کو بمبئی کے شوروغل کی بھینٹ چڑھا چکی ہو۔

Away from the sight of the thy face
My heart knows no rest or respite
And my work becomes an endless
Toil in a shoreless sea of toil .

آج ایک اجنبی ہمارے درمیان آگیا اور تم خاموش رہیں۔ اُس کی کار میں بیٹھ کر مجھے کیا سمجھانا چاہتی تھیں، پھر بس کے لیے پریشان ہونا۔ یہ سب کیا تھا، کیوں تھا، تم کیا ثابت کرنا چاہتی تھیں، یہ انتقام تھا یا کچھ اور —— لیکن یہ سب طریقے تمھاری شخصیت کا حصہ نہیں ہیں۔ تمھارے اس رویّہ سے میرا کچھ بگڑا بھی نہیں، میں تو پہلے ہی خالی اور بیکار ہونے کا شدید احساس رکھتا ہوں۔ اگر تم مجھے شکست دینا چاہتی تھیں تو سنو —— ہماری آپس میں لڑائی نہیں ہے، اگر کبھی تھی تو میں بہت پہلے اپنی ہار مان چکا ہوں۔ تم اور میں ایک ہی شہر میں ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ کہاں ملا جائے، کیسے ملا جائے —— کیسے ہیں، کب تک ہیں۔ ٹھہرو، میرا سگار بجھ گیا ہے اور بیئر بھی ختم ہے۔ سمندر سے آنے والی ہواؤں میں نمی بڑھ گئی ہے۔ موم بتی بھی بجھ گئی ہے —— روشن کرلوں —— تمھیں موم بتیاں جلا کر بند کمرے میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا نا —— میں چھے سال سے ایسا ہی کرتا آرہا ہوں۔ رات کو جب اچانک نیند کھل جاتی ہے تو موم بتی جلا لیتا ہوں۔ کافی کی دو پیالیاں تیار کرتا ہوں۔ کتنی بچکانہ حرکت ہے —— بیٹھ کر تم سے باتیں کرتا ہوں، کوئی دیکھے یا سُنے تو ہنس دے۔ تمھاری کوفی ٹھنڈی ہوتی رہتی ہے۔ سگار کا دھواں تمھاری یادوں کو کئی روپ دیتا ہوا فضا میں تحلیل ہوتا رہتا ہے —— کوئی ہاتھ بڑھا کر میرے لبوں سے سگار نہیں نکالتا، منع نہیں کرتا۔

کمرے میں خاموشی ہے —— آج تم سے ملاقات ہوئی اور نہیں بھی۔ میں نے تمھیں اچانک دیکھ کر سوچا تھا کہ زندگی کے گیت کو سُر مل گئے۔ کھنڈر میں زندگی کی حرارت آجائے گی، لیکن تم نے اس کے رہے سہے

نشانات بھی ختم کر دینے چاہے، اب یہاں پھر ہُو کا عالم ہے اور ایک بندر نما شخص کتے کی زنجیر تھامے اسے اپنے بیہودہ وجود سے ناپاک کر رہا ہے ——— وہ شام یاد ہے جب ہم کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے اور تمھارے چچا وہاں پہونچ گئے تھے، خاندان کی ناک لیے اور تم نے وہ ناک ان کی ہتھیلی سے اٹھا کر ان کے مُنہ پر دے ماری تھی۔

"چاچا جی، میں بچّی نہیں ہوں، بے وقوف بھی نہیں۔ اگر آپ کو میری ڈیٹ آف برتھ یاد ہو تو میں اب قانونی طور پر بالغ ہو چکی ہوں اور آپ سے زیادہ خاندان کی عزّت کا خیال رکھتی ہوں۔ آج آپ ہمارے ہمدرد بن کر ہماری عزّت بچانے آ گئے ہیں۔ آپ سے کس نے کہا کہ میری عزّت خطرے میں ہے۔ جب ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے تھے، تب آپ کو اپنے بھتیجوں، بھتیجی کا خیال نہیں آیا۔ پتا جی کی موت پر ماں کا سارا زیور اور نقدی آپ ہڑپ کر گئے۔ اس وقت خاندان کا خیال کہاں تھا، دکان سے ایک پیسا نہیں دیا۔ ہمیں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا جب آپ کا خون کیوں سفید تھا ——— جائیے، مجھے آپ کی اس جھوٹی ہمدردی اور حفاظت کی ضرورت نہیں ہے میں خود اپنی حفاظت کر سکتی ہوں، جا کر تمام رشتہ داروں اور خاندان والوں سے کہہ دیجیے کہ رجنی مُنہ پھٹ، بدتمیز اور بے حیا ہو گئی ہے۔ بد چلن اور آوارہ بھی کہہ سکتے ہیں آپ!"

مَیں تمھارے چچا کے چہرے پر تیزی سے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا، بھنچتی ہوئی مٹھیوں اور پیشانی کی شکنوں پر میری نظر تھی۔ ریستوراں میں بیٹھے تمام لوگ، بیرے اور مالک، سبھی ہماری طرف متوجّہ تھے۔ تمھاری شخصیت کا ایک نیا پہلو میرے سامنے ابھرا تھا جس نے مجھے حوصلہ، خود اعتمادی اور گہرائی دی تھی۔

جب تمھارے چچا بڑبڑاتے اور پھنکارتے چلے گئے تو تم تھکی ہاری سی کرسی پر گر پڑی تھیں، تمھاری آنکھیں مُندی ہوئی تھیں اور سانس تیز چل رہا تھا۔ جب کئی منٹ گزر جانے پر تم نے آنکھیں کھولیں تو ٹھنڈی کوفی ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے کھڑی ہو گئیں۔

"اب میں جاؤں گی۔"

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے تمھارا ہاتھ تھام کر ہولے سے کہا تھا:

"رجنی، یہ تم نے اچھا نہیں کیا، تمھارے چچا دھمکی دے گئے ہیں۔"

"تم اتنے ڈرپوک ہو۔" تم نے رُک کر میری طرف دیکھا ——— "اس سے کم اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ کمینہ، ذلیل اور خود غرض آدمی ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے رشتہ داروں میں سے کوئی اُٹھ کر تمھاری بے عزّتی کرے اور وہ بھی میری موجودگی میں۔"

"پھر بھی وہ تمھارے ———"

"پھر بھی کیا..." تم بپھر گئیں، "تم بھی کمال آدمی ہو۔ جو کچھ میں نے کیا اور کہا، پوری ذمّہ داری اور سوچ سمجھ کر کیا اور اس کے لیے ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے جھوٹے، دوغلے، کمزور اور کمینے آدمی اچھے نہیں لگتے ——— پھر کبھی مجھے اس طرح سمجھا کر شرمندہ نہ کرنا۔ میں ذرا دوسری قسم کی، اُلٹی کھوپڑی کی لڑکی ہوں۔" اور تم مسکرا دی تھیں۔

مَیں خوش بھی ہوا اور کہیں دل کی گہرائی میں تھوڑا سا خوف زدہ بھی۔

اور آج تم نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔

سنو رجنی، تم پل بھر کو میرے ساتھ اس فلیٹ میں آ جاتیں تو میں گیتا انجلی، موم بتیوں اور تمھاری تصویر کی گواہی

میں بتاتا کہ تم میرے لیے کیا ہو —— تم ایک ذرا سی بات، معمولی سے واقعہ کو Prestige کا مسئلہ بنا بیٹھیں۔ اگر میرے Parents ریل حادثہ میں سورگباش نہ ہو جاتے، اگر یہ نوکری مجھے بمبئی نہ لے آتی اور ہمارا کاروبار تباہ نہ ہو گیا ہوتا تو شاید تم سے ملاقات نہ ہو پاتی۔ رجنی، میں جب بھی نہر کی پٹری پر گیا ہوں، جب بھی ان شکستہ سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں، تم میرے ساتھ رہی ہو، سوکھے پتوں پر تمھارے سبک قدموں کی آہٹ سنائی دی ہے، پانی میں تمھارا سانولا نمکین چہرہ تیرتا نظر آیا ہے، تمھاری کانچ کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی ہے اور پھر کئی کئی دن تک اپنے کمرے میں بند رہا ہوں۔ کہاں کہاں تمھیں میں نے نہیں ڈھونڈا، کس کس سے نہیں پوچھا!

وہ شام یاد ہے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں پچھلی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا کنیر اور املتاس کے پھولوں کو دیکھ رہا تھا، یوکلپٹس کی ہری پتیوں کی جالی کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا، آسمان پر بکھرے بادلوں کے ٹکڑوں کے کنارے گلابی ہو گئے تھے اور کتھئی پروں والی ایک چڑیا نہ جانے کہاں سے اڑتی ہوئی کھڑکی کے سامنے امرود کی ڈالی پر آن اتری اور گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ تبھی میری بہن سرلا کی آواز سنائی دی:

" آ جا بھئی، شرمائے جا رہی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا —— وہ دروازے میں کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک نازک سی، سانولی کلائی تھی، جس میں کانچ کی چوڑیاں رہ رہ کر بج اٹھتی تھیں۔ یہ بازو میں صرف کہنی تک دیکھ سکتا تھا اور اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ کسی لمبی، پتلی لڑکی کی کلائی ہوگی —— ایک ہی جھٹکے سے سرلا نے تمھیں اندر کھینچ لیا —— لمبی، پتلی، نازک، سلونی، تیکھے نقوش اور گھنے لمبے بالوں والی لڑکی —— گہری، کمان سی بھنویں، بھنوروں سی آنکھیں، شرما رہی تھیں اٹھ رہی تھیں اور جھک رہی تھیں —— شانت جھیلوں کی طرح —— اور جب وہ میری نظروں سے ملیں تو مجھے کئی گم شدہ جزیروں کا پتا مل گیا، وہ جزیرے جن میں میں بھٹکا کرتا تھا —— ان آنکھوں میں گہری اداسی تھی اور اس اداسی میں گیت گونج رہے تھے —— میرا بائی کے گیت —— میرا درد نہ جانے کوئے —— اور وہ گیت وہاں سے سیدھا میرے دل میں آ گیا اور وہیں رہ گیا —— تمھیں پتا ہے تمھاری آنکھوں میں کیا ہے۔

پتا نہیں کتنی صدیاں گزر گئی تھیں جب سرلا نے کہا تھا: "بیٹھ بھی جا اب، ہو چکا شرمانا۔"

تم دیوان پر بیٹھ گئیں۔ دائیں ٹانگ بائیں گھٹنے پر، انگوٹھا قالین کے پھولوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔ تم خاموش تھیں، میں چپ تھا، سرلا بھی کسی سوچ میں تھی اور باہر چڑیاں بدلتے موسم کے گیت گا رہی تھیں۔ ہم مہذب ہو رہے تھے۔

" سرلا، اپنی سہیلی کا پریچے تو دو ——"

" یہ رجنی ہے، میری بہت پیاری سہیلی، میرے ساتھ پڑھتی ہے اور تمھاری طرح لٹریچر کی دیوانی ہے۔ میں نے سوچا، چلو بھیا سے ملا دوں، آج کل چڑیوں پر ریسرچ کر رہے ہیں ——" وہ شرارت سے مسکرائی۔

" یہ بہت اچھا کیا، مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس تواریخی شہر میں لڑکیاں صرف مندر، گوردوارے جاتی ہیں یا انگیٹھیاں سلگاتی ہیں، بہت ہوا تو رومانی ناول پڑھ لیے۔"

" آپ شاید اس کمرے سے کم نکلتے ہیں،" تم نے کہا تھا۔

"اب یہی سچ لگ رہا ہے۔"

"تم بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کرو، مَیں ذرا چائے کا انتظام کرتی ہوں۔"

سرلا چلی گئی اور شاید اُس کے ساتھ تم بھی۔ دیوان پر تمھارا سانولا بدن خالی خالی سا لگ رہا تھا، مَیں نے تمھیں ڈھونڈنے کے خیال سے کہا۔

"قالین کے پھولوں میں کچھ نہیں رکھا۔"

"جی۔"

"میرا مطلب ہے تم کسی بنگالی ناول کے کردار تو نہیں ہیں، میوزیم میں رکھے ہوئے بت بھی نہیں، کیوں نہ کوئی بات کریں۔ مثلاً یہی کہ آپ کو ہری چوڑیاں کیوں پسند ہیں۔"

تم جواب میں مسکرا کر رہ گئیں۔

باتوں باتوں میں بہت سے مُلکی اور غیر مُلکی ادیبوں کا ذکر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تم نے بہت کچھ پڑھ رکھا ہے، ریل یا بس کے سفر میں نہیں، توجہ اور دلچسپی سے، ادب کے ایک طالب علم کی طرح۔ تمھیں شرت چندر، دوستوئیفسکی، فلابیئر پسند تھے۔ اُردو تم صرف منٹو کو پڑھنے کے لیے سیکھ رہی تھیں۔

سرلا کی اور بھی کئی سہیلیاں تھیں۔ جدید لباس، فلموں، زیور اور کھانے پینے کی شوقین۔ فلاں دکان کی چاٹ اچھی ہوتی ہے، فلاں درزی بلاؤز اچھے سیتا ہے۔ اُن سے مل کر، باتیں کر کے لگتا کہ برسوں سے ایک ہی لڑکی، روپ بدل بدل کر سامنے آ رہی ہے، لیکن تم ان سب سے الگ تھیں، جیسے گھاس میں کہیں گلاب کا پودا اُگ آئے ——— بنا میک اپ کا چہرہ، سادگی اور سنجیدگی ——— مریضانہ سنجیدگی نہیں؛ باوقار، ذہانت کی آئینہ دار سنجیدگی۔

سرلا چائے لے آئی۔ بہت سی باتیں ہوئیں لیکن تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میرے کریدنے پر بھی ٹالتی رہیں۔ جاتے ہوئے تم سارتر کے ڈراموں کا مجموعہ لے گئیں۔ تمھیں دُور جانا تھا۔ تمھارے جانے کے بعد موسم نہ جانے کیوں پھیکا اور اُداس سا ہو گیا۔ میں نے سرلا سے تمھارے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا:

"اُسے شام کو ٹیوشن کرنا ہوتی ہے۔ بے چارے غریب لوگ ہیں، باپ نہیں ہے، ماں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہے، دو چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک کسی دکان پر نوکر ہے، دوسرا کسی موٹر گیراج میں کام سیکھ رہا ہے۔"

سرلا چلی گئی۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں اُداس ہو رہا ہوں، یہ عجیب سی اداسی تھی جس کا اور چھور نہیں مل رہا تھا، وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں گھر سے نکل آیا۔ کار لے کر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کئی پٹرول پمپ، کئی گیراج، کئی مستریوں کے پاس گیا، وہاں کام کرنے والوں لڑکوں کو یونہی دیکھتا رہا، آخر تھک کر کلب چلا گیا۔ وہسکی پی، رمی کھیلی اور ہارتا رہا۔

تم کبھی کبھی سرلا کے ساتھ ہمارے ہاں آنے لگیں۔ بہت کم بات کرتیں، لیکن مدلل اور سنجیدہ۔ میں حیران ہوتا کہ سرلا جیسی شوخ و شریر لڑکی تمھاری سہیلی کیسے بن گئی۔ تم دھیمے سے مسکرانے والی، وہ بے باک قہقہوں کی رسیا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ تم خود پر جبر کر رہی ہو، کسی غم کو اپنے اندر کی آنچ پر دھیرے دھیرے پکا رہی ہو۔ مجھے زندگی کا یہ رویّہ کبھی پسند نہیں آیا۔ میں نے ایک بار برآمدے کی سیڑھیوں پر تم سے کہا تھا:

"کون سا زہر ہے جو پی کر خاموش ہو گئی ہو۔"

"کبھی اندھیری، بدبودار گلیوں میں جائیے تو پتہ چلے" تمھارے ہونٹوں پہ وہی مسکراہٹ تھی جو کناروں تک نہیں پہنچی۔

"زندگی میں زہر بھی ہے اور امرت بھی، کون اپنے لیے کیا پسند کرتا ہے، یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"کلب کے ہرے، سایہ دار لان پہ ایزی چیئر زمیں پڑے پڑے، بیر سپ کرتے ہوئے یہ بحث اچھی لگتی ہے۔ یہ فلسفہ ڈرائنگ روم سے باہر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زہر اپنی خوشی سے صرف بھگوان شو نے پیا تھا، اور ہر آدمی شو نہیں ہوتا۔ آدمی کی مجبوری کو اس کا ذاتی معاملہ کہنا بہت بڑا مذاق ہے اور گھناؤنا بھی۔"

تمھارا لہجہ زخمی روح کا غماز تھا۔ تم برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی تھیں اور اس وقت اس ستون سے بھی زیادہ مضبوط اور اونچی دکھائی دے رہی تھیں۔

"تم نے مجھے غلط سمجھا ہے، میں نے مذاق نہیں کیا، میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ آدمی اس زندگی سے خوشیاں بھی حاصل کر سکتا ہے" میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی بات اس تک پہونچا نہیں پا رہا ہوں۔ اندر ہی اندر کہیں اُلجھنے کا احساس مجھے صحیح اور مناسب الفاظ استعمال نہیں کرنے دے رہا تھا۔

تمھارے ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ تم کتنی پُرسکون اور پُر اعتماد تھیں۔ تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید تم مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھیں اور تمھارے اس انداز، اس مسکراہٹ نے میری انا کو زخمی کیا تھا۔ میرے ماحول میں لڑکیاں نہ اتنی بوجھل بحث کرتی تھیں اور نہ زہر اور گندی بستیوں کا ذکر اس فخر سے کرتی تھیں، ذکر کرتی ہی نہیں تھیں۔

پھر تم چلی گئیں۔ میں تمھاری چپّل، معمولی سی دھوتی اور سراپے کو دیکھتا رہا، پھر وہیں برآمدے میں بیٹھ گیا۔ لگا تم ستون سے لگی کھڑی مسکرا رہی ہو۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے سامنے لان سے سائے اپنے آپ کو لپیٹ کر رخصت ہوئے، درختوں پر چڑیاں خاموش ہوگئیں، نوکر نے بتیاں روشن کردیں۔ تم نے مجھے پھر اُداس کر دیا تھا، میرا جی کہیں جانے کو نہیں ہوا، ماں کے پکارنے پر اٹھا، ستون پر ایک نگاہ ڈالی اور کھانے کی میز پر جا بیٹھا ——— وہاں سے اُٹھا تو اپنے کمرے میں آ۔ الماری میں Crime and punishment کی جگہ خالی تھی۔ تم لے گئی تھیں۔ اسی برآمدے میں میرے ایک دوست نے اس کتاب کو "مرڈر مسٹری" کہا تھا۔ تم نے شاید ٹھیک کہا تھا۔ ہماری زندگی کیا تھی؟ ڈرائنگ روم کے صوفے، لین، کلب، سنیما، پکنک؛ بعد از ڈنر لطیفے، جنھیں کوفی میں گھول کر پیا جاتا ہے اور جن کی داد انگریزی میں دی جاتی ہے اور تمھارے ہاں زندگی پر الم نغی ——— تم سمندر بنی رہیں اور میں پہاڑ ——— کہتے ہیں لاکھوں برس پہلے یہ چوٹیاں سمندر سے نکلی تھیں۔

تم کبھی کبھار اکیلی ہی میرے کمرے میں چلی آتیں اور دیر تک بیٹھی رہتیں، ادب پر گفتگو ہوتی، تم سیکس Sex کے موضوع پر بھی بنا جھجک بات کرلیتی تھیں۔ پہلے پہل تو مجھے حیرانی ہوئی ——— لڑکیاں تو ایسی باتیں، یوں نہیں کرتیں، ہمارے سرکل میں تو یہ ٹیبو ہے، لیکن تم پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے بات کرتی تھیں۔ ایسے مواقع پر ماں کئی بار کمرے میں، کسی نہ کسی بہانے سے آجاتی۔ تم سے بار بار کے پوچھے ہوئے سوالات پوچھتی، تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتی۔ ایک بار تم نے کہا تھا:

"ماں میرا اس طرح یہاں آنا اور بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔"

"نہیں، یہ تمھارا وہم ہے، انھوں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا، ہمیشہ سراہتے تمھارے اور تمھارے گھر والوں

کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں ۔"

"کہا تو کبھی کچھ نہیں ، پھر بھی ، میں سوچتی ہوں ، مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے ، کم از کم اس کمرے میں ۔"

"کیوں ؟"

"ہو سکتا ہے میں آپ کو اغوا کر لوں ۔" تم مسکرا دیں ۔

مَیں اس زور سے ہنسا کہ کوریڈور سے گزرتا نوکر کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا ۔

"امیر آدمی اپنی ہر چیز کے بارے میں بہت محتاط ہوتا ہے ۔"

"امیری غریبی کا چکر دوستی میں نہیں ہوا کرتا ۔" میں نے لفظ 'دوستی' احتیاطاً برتا تھا اور تمھارا ردِ عمل جاننے کے لیے تمھاری طرف دیکھا تھا ۔

تم بھی اس لفظ پر چونکی تھیں لیکن تم نے اپنے اندر کسی تبدیلی کو ظاہر نہیں ہونے دیا ، ہنس کر ٹال گئیں تھیں خود پر کتنا قابو تھا ، تم خود کو کتنا بہتر طور پر سمجھتی تھیں !

انھیں دنوں بھارت سیوک سماج کے منتظمین نے کلب میں ایک میٹنگ کی ۔ شہر کے تمام رائے صاحبان ، رئیس ، کارخانے دار ، بڑے بڑے ڈاکٹر ، وکیل اس میں شامل ہوئے ۔ سماج سیوک ، یہ وہ لوگ تھے جو کسی تیسرے درجے کی گانے والی کے لیے بھی اسی طرح اکٹھے ہو جاتے تھے ، جنھیں انگریزی میں Elite of the city کہا جاتا ہے ۔ ٹیکس کی چوری ، ہیرا پھیری ، کالا بازار ، اسمگلنگ کرنے والے یہ سماج سیوک —— اس میٹنگ کے بعد وہی وہسکی کا دَور چلا ، موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر ہوا —— طے ہوا کہ شہر کے غریب طبقہ کی مدد کی جائے ، بے لوث خدمت کا جذبہ عوام تک پہنچایا جائے ۔ مجھے وہاں تمھارا خیال آیا ، سوچا اس بہانے تمھاری مدد کر دی جائے اور سلائی مشین بھجوانے کا فیصلہ کر لیا ۔ ایک غریب بیوہ کی اس سے بہتر مدد اور کیا کی جا سکتی ہے ۔

ہماری ملاقاتوں میں ابھی تک چیخوف ، موپاساں ، کامیو اور جیمز جوائس وغیرہ کو دخل تھا ، ہم تم بہت کم ہوتے تھے ۔ مجھے تو لگتا کہ یہ اتنے ڈھیر سارے ادیب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ہی جنم لیتے رہے ہیں ۔

"بھئی ، اب یہ گڑے مُردے اُکھاڑنے بند کرو ۔" میں نے ایک دن اُکتا کر کہا تھا —— "میں تو ان سے تنگ آگیا ہوں ۔"

تم اس روز کھُل کر ہنسی تھیں ۔

"لگتا ہے میرا پیچھا یہ زندگی بھر نہیں چھوڑیں گے ۔"

"تو کیوں نہ ان کو ان کی قبروں میں چین سے سونے دیں اور ہم چپکے سے کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں یہ سب نہ ہوں ۔"

"ٹھیک ہے ۔" تم نے بچّوں کی طرح کہا ۔ اُس وقت تمھاری آنکھوں میں بڑی پیاری چمک آگئی تھی ۔

"تو لاؤ ہاتھ ، کرو وعدہ ۔" میں نے ہاتھ بڑھا دیا ۔

تم نہ جانے کیوں جھجک رہی تھیں ۔

"لاؤ نا ۔"

اور تم نے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا ——— پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ تم نے نظریں جھکا لیں، اس پل تمھارے ہونٹ کتنے خوبصورت اور رسیلے لگ رہے تھے اور میرا من مچل رہا تھا، پھر نہ جانے کہاں سے ڈھیر سارے زولاؤں، شیکسپیئروں، طالستائیوں اور نٹ ہمسنوں کا بوجھ مجھ پر آ پڑا اور میں اپنے ہی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"No writers today" میں نے کہا۔

'Thank God'

لیکن اب مشکل یہ تھی کہ باتیں کیا کی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کے ساتھ محض دوستی بہت بڑا فراڈ بن کر رہ جاتی ہے۔

"چلو، میں تمھیں سر لا سے ملا لاؤں۔"

"اس میں آپ کی مدد کی کیا ضرورت ہے۔"

"تو آؤ پھر آوارہ گردی کریں۔" میں کھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں آوارہ گرد نہیں ہوں۔"

"بھئی، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔"

"پہلے آپ اپنا مطلب خود سمجھ لیں، پھر مجھے سمجھا دیجیے گا۔"

"میرا مطلب ہے ہمیں سیر کرنی چاہیے۔"

وہ پیلے پت جھڑ کی ایک شام تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے، لوگوں کی باتیں، تمھارے کالج کی، تمھاری پسند ناپسند کی۔ شیشم کا ایک زرد، سوکھا ہوا پتہ ہوا میں قلابازیاں کھاتا، تمھارے بالوں میں آ اٹکا تھا۔ تم نے اسے پھینکنا چاہا تو میں نے وہ پتہ تمھارے ہاتھ سے لے لیا۔ تم نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں مسکرا دیا۔ تم دوسرے ہی پل ایک دکان کی طرف گھوم گئیں۔

وہ ایک بہت بڑا اسٹور تھا۔ تم اپنے لیے کچھ چیزیں پسند کر رہی تھیں، میں ٹائیاں دیکھنے میں محو تھا۔ تم نے دو چار چیزوں کے دام پوچھے اور مہنگی ہیں، کہہ کر چھوڑ دیں۔

"کچھ لوگوں کو لینا دینا تو ہوتا نہیں، آ جاتے ہیں یہاں سیر کرنے۔"

"کیوں صاحب، کیا ضروری ہے کہ گاہک آپ کے ریٹ پر چیز خرید لے۔ آپ کو اپنا behaviour ٹھیک کرنا چاہیے۔" میں نے درشتی سے کہا "آپ دکاندار ہیں، ٹھاکے دار نہیں۔"

"چھوڑیے۔" تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر دکان سے باہر لے جاتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" فٹ پاتھ پر سر جھکائے خاموش چلتے ہوئے، تم بظاہر شانت دکھائی دے رہی تھیں، لیکن میں تمھارے اندر کروٹیں لیتے، کچوکے لگاتے غم کو محسوس کر سکتا تھا۔ دکاندار کے رویہ نے تمھیں خاصا Upset کر دیا تھا۔ اور یہ مجروح احساس تمھاری اداس آنکھوں کو اور بھی اداس کر گیا تھا، لگتا تھا پت جھڑ کی وہ رت تمھارے وجود میں آکر مجسم ہو گئی ہے۔

"رجنی، یہ کاروباری لوگ کسی کے احساسات کو نہیں سمجھتے، ان کے ذہن ایک طے شدہ پٹری پر ہی چلتے ہیں،

ان کی باتوں کا نوٹس نہیں لینا چاہیے۔"

"برا تو نہیں مانا، یہ دکھ ضرور ہوا ہے کہ ہمارے ہی دیش میں، ہمارے لیے کچھ نہیں، عزت بھی نہیں، حالات نے آدمی سے آدمیت تک چھین لی ہے، اُس کا بھی کیا دوش، وہ ایک ایسے سماج میں جی رہا ہے، جہاں بڑھیا لباس، بھاری جیب، موٹر، آدمی سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یہ چودہ روپیا والی دھوتی پہن رکھی ہے، جسم پر کوئی زیور بھی نہیں، مجھے اتنے بڑے اسٹور میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا، غلطی میری تھی۔" تم پیڑوں پر بکھری دھوپ کو دیکھ رہی تھیں۔ "نہ جانے یہ دھوپ اندھیرے گھروں میں کب تک پہنچے گی۔"

نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا، جس کے تحت میں نے تمھارے گرد بازو ڈال کر خود سے لگا لیا۔ ایک پل کے لیے سب کچھ بھول کر، ہم ایسے ہی کھڑے رہے، پھر تم اپنا آنچل سمیٹتی ہوئی الگ ہو گئیں۔ تمھیں ٹیوشن کا خیال آگیا۔

"آج مت جاؤ۔"

"بچّوں کے امتحان سر پر ہیں۔"

"ٹیلی فون کیے دیتے ہیں، ایک دن نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"یہ غیر ذمّہ داری ہوگی۔"

مَیں خاموش ہو گیا، کبھی کبھی تمھاری ضد سب کچھ ختم کرنے پر تُل جاتی تھی، اور میری انا سر تان کر سامنے آجاتی۔ اُس وقت میں چپ ہو گیا، تم ایک پل کھڑی رہ کر چلی گئیں۔

ایک دن جب سر لانے کالج سے چھٹی کی تھی، مَیں تمھارے کالج پہنچ گیا۔ پرنسپل نے تمھیں بلوایا۔ میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ سر لانے تمھیں بلایا ہے، وہ بیمار ہے۔ تم نے کلاسز ختم ہو جانے پر آنے کا وعدہ کیا۔ میں خوش خوش وہاں سے آگیا۔ بازار گیا، تمھارے لیے اُون، ایک بڑھیا سی ساری اور کچھ دیگر سامان خریدا اور عین وقت پر کالج کے دروازے پر پہنچ گیا۔ تم ایک درخت کے سائے میں اکیلی کھڑی تھیں۔

"جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔" موٹر سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھتے ہوئے تم نے کہا۔

"اچھا لگا۔"

مَیں جھوٹ کی بات کر رہی ہوں، اچھا بُرا لگنے کی نہیں۔"

"جناب، جھوٹ اس وقت بہت بڑا سچ بن جاتا ہے، جب مخاطب پر ظاہر ہو جائے اور وہ صاحب اپنی مرضی سے اسے سچ بنا دیں۔"

"اگر پرنسپل کو شک ہو گیا تو ——"

مَیں سوچ رہا تھا کہ تم فلمی ہیروئن کی طرح میرے شانے پر سر رکھ دوگی اور کوئی پیار بھرا گیت گانے لگوگی۔ لیکن تم بیچ میں اُس موٹی عینک والی پرنسپل کو لے آئیں۔

"اُسے جو ہونا ہے ہو جائے۔ تم اپنی بات کرو۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"جہاں کہو چلتے ہیں۔"

"واپس۔"

میں نے زور سے بریک لگائی، تم تقریباً مجھ پر آگریں۔ پلٹ کر دیکھا تو تم مسکرا رہی تھیں۔

پھر ہم اس ویران مندر تک پہنچ گئے۔ سیڑھیوں پر بیٹھی تم اونچے، گھنے درختوں میں پھیلی خاموشی کو جیسے بوند بوند پی رہی تھیں، چاروں طرف سوکھے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے، کچھ فاصلے پر نہر بہہ رہی تھی۔ میں پنکھیوں کے پر اکٹھے کر رہا تھا۔ میں نے ڈھیر سارے رنگین پر لے جا کر تمھارے آنچل میں ڈال دیے۔

تم نے انھیں دیکھا، چھوا اور مسکرا دیں۔ پر رومال میں باندھ کر تم مندر میں چلی گئیں۔ میں نے اون وغیرہ کے پیکٹ لیے اور تمھارے پیچھے گیا۔ تم دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہ سب ٹھیک نہیں ہے، یہ اتنے سارے رنگ، میں تمھارے ساتھ، یہاں، یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا، میں بھول گئی تھی —— چلو، واپس چلتے ہیں، میں گھر جاؤں گی۔"

"کیا ٹھیک نہیں، کیا بھول گئی ہو؟"، میں نے تمھیں شانوں سے تھام لیا تھا، تم نگاہیں جھکائے تھیں۔ "کچھ دیر بیٹھ کر چلیں گے۔"

"نہیں، واپسی ہی ٹھیک ہوگی۔"

ہم باہر آگئے اور نہر کی پٹری پر آہستہ آہستہ چلنے لگے، تم کسی گہری سوچ میں تھیں۔ میں خود کو ایک کٹی پتنگ کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ پٹری سے اتر کر ہم آموں کے باغ میں چلے گئے۔ ایک پیڑ کے نیچے رک کر میں نے تمھیں اپنی بانہوں میں لے لیا، میں نے سوچا تھا کہ اگر تم کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو تو میں اپنی محبت کا اظہار قدرے جوشیلے ڈھنگ سے کروں۔

تم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ تمھاری آنکھوں میں کوئی خوف یا پریشانی نہیں تھی، لیکن تم اس اچانک 'حملہ' کے لیے شاید ذہنی طور پر تیار نہیں تھیں۔ تمھاری نگاہوں نے مجھے ٹھنڈا کر دیا۔

"تم مجھے کسی گھاٹ اتار دگی بھی کہ نہیں۔"

"میں خود سے مل کر کوئی فیصلہ کر لوں، میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی جس کے لیے بعد میں مجھے پچھتانا پڑے۔"

"تم مجھ پر شک کر رہی ہو، تم سمجھتی ہو میں تمھیں یہاں تمھاری تنہائی اور کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے لایا ہوں، تمھیں Exploit کر رہا ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" تم نے اطمینان اور تحمل سے جواب دیا۔ "صرف میں اپنے آپ میں Clear نہیں ہوں، میں ابھی اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے پا رہی، مجھے تھوڑا سوچنے کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے پیکٹ زمین سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ کیا ہے؟"

"دیکھ لو۔"

"میں کچھ نہیں لوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں جا کر نہر میں پھینکے دیتا ہوں۔" میں نہر کی طرف چل دیا۔
"ٹھہرو۔"
"رکھ لو، نہیں تو۔"
"میں اپنے گھر والوں کو کیا سمجھاؤں گی۔"
میں نے اس طرح کو سوچا ہی نہیں تھا۔
"میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"
"میں خود ٹوٹ جاؤں گی۔"
"میں سنبھال لوں گا۔"
"یہ ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں، یہ ویران مندر، یہ سوکھے پتے دیکھ رہے ہو، اگر تم کمزور یا جھوٹے ثابت ہوئے تو یہ سب کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"
میں نے ایک انجانی مسرت کے نشے میں چور، تمھارا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا، جب تم نے ہولے سے آنکھوں کے جھروکوں پر پلکوں کے ریشمی پردے گرا لیے اور تمھارے ہونٹ نیم وا ہو گئے، میں نے یوں تمھارے ہونٹوں کو چوما جیسے تتلی پھولوں پر اترتی ہے۔ تمھارے ہونٹوں کی وہ نرم حدت، وہ نشیلی مٹھاس آج بھی میری روح میں تازہ ہے، زندہ ہے۔
تم میرے سینے سے یوں آلگیں جیسے درخت سے بیل لپٹ گئی ہو۔
"مجھے غلط مت سمجھنا۔" تم نے میرے سینے سے لگے لگے کہا تھا۔
واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ مجھے جنت مل گئی ہے۔
دو چار دن بعد میں تمھارے گھر گیا۔
اگر دیواروں، دروازوں اور چھتوں کو گھر کہا جاتا ہے تو وہ واقعی گھر تھا —— تنگ بازار، گندی گلی۔ اندھیرا، چھوٹا سا مکان، سیلن زدہ، بدبودار، دھوئیں سے کالی چھتیں، اکھڑا ہوا پلستر، کاکروچ، جھینگر اور گھٹن —— تم وہاں رہ رہی تھیں، اپنی نیک، محنتی ماں اور دو بھائیوں کے ساتھ۔ گلی میں جا بجا کوڑے اور غلاظت کے ڈھیر لگے تھے، گھروں کے پرنالے ٹوٹے ہوئے تھے اور ان سے گندہ پانی گلی میں گرتا رہتا تھا، گھروں میں شور تھا۔ گالیوں، دھمکیوں، مار پٹائی، رونے چیخنے، فلمی گانوں، برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کا —— ننگے، بیمار سے بچے، چڑچڑی، بیزار عورتیں، لڑنے پر آمادہ، بھدے جسموں کی بھدی نمائش کرتی ہوئی، شرم و حیا سے بے نیاز، کمر پر بچے لٹکائے، تھڑوں، کھڑکیوں اور جنگلوں پر جیسے لٹک رہی تھیں، جن کے جسموں کی دلکشی، نرمی، لوچ اور آواز کی مٹھاس وہاں کی بھوک، غلاظت، اندھیرا اور سیلن کھا گئی تھی۔ وہ عورتیں جو خاوند سے مار کھا کر رات کو اس کا بستر گرماتی ہیں اور صبح پڑوسیوں سے لڑتی ہیں، بچوں کو مارتی ہیں۔
"تم —— یہاں رہتی ہو!"
"زیادہ آبادی ایسی ہی جگہوں پر رہ رہی ہے۔"
"میں تمھاری بات کر رہا ہوں۔"
"میں اُن لاکھوں میں سے ایک ہوں۔"

"اگر تمھارے لیے کسی بہتر جگہ کا انتظام ہو جائے تو۔"

"خرید ہم سکتے نہیں، زیادہ کرایہ بھی نہیں دے سکتے۔"

"یہ سب شرطیں تو میں نے رکھی نہیں، میں تو صرف اچھی جگہ کی بات کر رہا ہوں۔" اس وقت میرے ذہن میں اپنا آبائی مکان تھا جو ان دنوں بند پڑا تھا۔

تبھی گلی میں شور سنائی دیا۔ کوئی عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی:

"یہ سب یہاں نہیں چلے گا، کیلاش کی ماں، آج پھر تیرے بیٹے نے پتو سے پیسے چھین لیے ہیں، میں کہے دیتی ہوں، یہ بدمعاشی ٹھیک نہیں، محلّے میں رہنا ہے تو شریفوں کی طرح رہو، جب دیکھو کچھ نہ کچھ چھین لیتا ہے۔"

تمھاری ماں نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا اور اُٹھ کر باہر چلی گئی، تم بھی اس کے پیچھے چلی گئیں۔ میں ہلکی زرد روشنی والے بلب کے عین نیچے بیٹھا اِدھر اُدھر دوڑتے کاکروچ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تم لوگ وہاں اس ماحول میں سانس کیسے لیتے ہو۔

باہر وہ عورت تمھاری ماں سے جھگڑ رہی تھی۔ اگلی پچھلی کہانیاں کہہ رہی تھی، جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ کیلاش ایک آوارہ گرد، غیر ذمہ دار اور بھٹکا ہوا لڑکا ہے، جو محلّے والوں کے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ تمھاری ماں دبے دبے لہجے میں اس عورت کو خاموش رہنے کے لیے کہہ رہی تھی اور وہ بے قابو ہو رہی تھی۔ تم تیزی سے اندر آئیں، ایک کوٹھری سے کچھ نکال کر لے گئیں، چند منٹ بعد باہر شانتی ہو گئی۔

تمھاری ماں پریشان اور شرمندہ سی چٹائی پر آ بیٹھی۔

"یہ وِدّیا کی ماں بھی بس عجیب ہے، کیلاش گلی میں تین ہیں، پتہ نہیں کس کا جھگڑا تھا، یہ عورت دن میں تین چار لڑائیاں نہ لڑے تو اسے چین نہیں آتا۔ اپنا کیلاش تو صبح جلدی ہی کام پر چلا گیا تھا۔"

تم اس دوران سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ شاید اس جھگڑے اور ماں کی صفائی پر شرمندہ تھیں۔ میں اصلیت سمجھتے ہوئے بھی تمھاری ماں کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"کلموہی نے چائے بھی نہیں پینے دی آرام سے، رجنی بٹیا چائے گرم کر لا۔ تو بیٹھ، میں ہی کر لاتی ہوں۔" ماں کچن میں چلی گئی۔

"یہ اچھی جگہ نہیں، یہاں سے نکلو۔"

"ہماری کچھ مجبوریاں ہیں ——" تم نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "ہم لوگ بہت غریب ہیں، یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے، چائے کی ٹوٹی، سستی پیالیاں، پرانی چٹائی اور یہ گھر اس کا کھلا ثبوت ہیں، یہ سب ہمارے پرانے ساتھی ہیں، نہ ہم انھیں چھوڑ سکتے ہیں اور نہ یہ ہمیں۔"

اچانک باہر کا دروازہ پھٹاک سے کھلا اور جیسے طوفان اندر آ گیا —— گالیاں مرنے مارنے کی دھمکیاں، ماں تقریباً سہم گئی تھی، تم بھی خاموش ہو گئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک پندرہ سولہ سال لڑکا یوں تن کر کھڑا تھا جیسے ساری دنیا کو للکار رہا ہو، اس کی قمیص کے بٹن کھلے تھے، نیچے بنیان نہیں تھی، گلے میں کالا تاگا تھا، سر کے بال خشک اور لمبے تھے، آنکھوں میں جیسے الاؤ جل رہے تھے۔

"کہاں ہے وِدّیا کی ماں؟" وہ کسی تھانیدار کی طرح گرجا۔

"کیلاش ——" تم نے قدرے سختی سے کہا —— "کیا بک بک لگا رکھی ہے، کوئی آیا گیا تو دیکھ لیا کرے۔"

"مَیں کسی کی پروا نہیں کرتا، کہاں ہے وہ سالی، ابھی دیکھے لیتا ہوں۔"

"تیرا دماغ خراب ہوا ہے۔" ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اب تو سیانا ہو گیا ہے، کیوں مجھ غریب کی عزت مٹی میں ملانے پر تُلا ہے، روز لڑائی جھگڑا، روز کلیش اچھا نہیں ہوتا۔"

"تو آج کام پر نہیں گیا ——"

وہ بنا جواب دیے گلی میں چلا گیا۔

"دیکھ لوں گا ایک ایک کو۔" گلی میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ "سالے بڑے ساہو بنے پھرتے ہیں، کون جانتا ہے پولیس میں، ایک ایک کا کچا چِٹھا جانتا ہوں، یہ جو یہاں بکواس کر گئی تھی، اس کا گھر والا نشے کی گولیاں بیچتا ہے، اس کے گھر کون کون اور کیوں آتا ہے، سب مجھے معلوم ہے، ابھی تھانے جا کر رپٹ لکھواتا ہوں، وہ گنجا چوری کا پیتل بیچتا ہے اور وہ پنڈت، سالا اسمگلنگ کرتا ہے۔"

رجنی، جب مَیں تمھارے ساتھ اُس گلی سے باہر آیا تو لگا مَرتے مَرتے بچا ہوں۔ مَیں مجبور کر کے تمھیں اپنے ساتھ لے گیا۔ کوفی ہاؤس میں تم میرے سامنے خاموش بیٹھی تھیں، تمھارے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے، میں بھی خاموش بیٹھا تھا۔ آخر تم نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ یہی نا کہ ہم کیسے لوگ ہیں، کیا کرتے ہیں، کیسے اور کیوں جی رہے ہیں، ہمارے پڑوسی کیسے گھٹیا اور گرے ہوئے لوگ ہیں۔"

"نہیں، مَیں یہ سب نہیں سوچ رہا، مجھے وہاں بیٹھے گھٹن ضرور آ رہی تھی، گھبراہٹ ہو رہی تھی، لگتا تھا ابھی کوئی بیہودہ سا حادثہ ہو جائے گا، مَیں ڈر رہا تھا —— لیکن تب بھی مَیں تمھارے بارے میں سوچ رہا تھا اور اب بھی وہی سوچ ہے کہ تم وہاں سے نکلو۔"

"میرے وہاں سے نکل آنے سے کیا پرابلم ختم ہو جائے گی۔" تم مسکرا دیں: "وہ ماحول، وہ حالات بدل جائیں گے، وہ گندی گلیاں، ٹوٹے ہوئے پرنالے، چڑچڑی عورتیں، زندگی سے اُکتائے ہوئے لوگ بدل جائیں گے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کیا —— نہیں ایسا نہیں ہوگا، ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو ایک بہت بڑے پرابلم کا معمولی سا حصّہ ہوں، وِدیا کی ماں ہو کہ گنجا چرسی، راٹھو چیراسی ہو کہ خیراتی بدمعاش، سب ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں، ہم ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے ہیں۔ ماں بیمار ہوئی تھی تو یہی وِدیا کی ماں اس کی دیکھ بھال کرتی رہی، مَیں اُن لوگوں سے پیار کرتی ہوں۔"

"میں یہ فلسفہ تو سمجھتا نہیں اور نہ ہی دُنیا بھر کا درد میرے جگر میں ہے، میں صرف تمھیں جانتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم عزت اور آرام سے رہو، تمھاری ماں اور بھائیوں کے بارے میں بھی سوچتا ہوں، باقی کسی سے مجھے مطلب نہیں اور نہ میں کچھ کر سکتا ہوں اُن سب کے لیے، تمھاری یہ ضد، تمھارا یہ نظریہ صرف تمھیں نقصان پہنچائے گا، صرف تمھاری ذات کو اور اس سے مجھے دُکھ ہوگا، آدمی میں اتنی خودغرضی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اپنا بُرا بھلا پہچان سکے۔"

"خود غرضی والی بات کسی سطح پر بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

" تم نہیں چاہتیں کہ بہتر زندگی گزار سکو ۔"

" میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ـــــــ ہم ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہیں ۔"

" سازش، پرابلم، ماحول ـــــــ " میں نے محسوس کیا کہ میں چڑ کر غصّہ میں آرہا ہوں، خود پر قابو پا کر کہا ـــــــ " مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ۔"

" وہی تو کر رہی ہوں ۔" تم شانت تھیں۔

میں چڑ گیا۔ تم شاید جان بوجھ کر مجھے میری نظروں میں ذلیل کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہی تھیں، میری ہمدردی، محبت، خلوص کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔

" تم کمیونسٹ تو نہیں ہو ـــــــ "

" کمیونسٹ بھی انسان ہوتے ہیں ۔"

اور تم اٹھ کر تیزی سے چلی گئیں۔ عجیب انداز تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔

سگار ختم ہو گیا ہے۔ ایش ٹرے میں راکھ رہ گئی ہے، کمرے میں مکمل خاموشی ہے۔ باہر سمندر کی آواز ہے کبھی کبھی کوئی تیز رفتار کار نکل جاتی ہے۔

میرے بار بار کہنے پر بھی تم نے اپنی سوچ نہیں بدلی۔ تم مجھے ملتی بھی رہیں اور یہ احساس بھی دلاتی رہیں کہ ہمارے بیچ کہیں کوئی غیر مرئی دیوار حائل ہے، ہم ملتے، کوفی پیتے اور جدا ہو جاتے، تمھیں کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا، یا ملاقات کسی تلخ اور بے معنی بحث کی نذر ہو جاتی۔

میں نے پتاجی سے مکان کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کرایہ دار لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کرایہ دار نہیں ہوں گے، ویسے ہی، تو انھوں نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور تم لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے تمھارا نام لیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے پھر بولے کہ وہ مکان بیچ دینا چاہتے ہیں اور بات ختم ہو گئی، شاید تمھیں اس کی بھنک سرلا سے مل گئی تھی۔ ایک شام تم نے پوچھ لیا:

" اس بہتر جگہ کا انتظام نہیں کیا ـــــــ "

" اگر یہ طنز ہے تو اچھا نہیں ۔"

اُنھیں دنوں تمھارا بھائی سونو، یونین کے چکر میں پڑ گیا تھا اور ایک ہڑتال کے سلسلے میں پتاجی سے ملنے ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ وہ مجھے جانتے پہچانتے ہوئے بھی کھنچا کھنچا سا رہا۔ پتاجی اندر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور وہ ان کے بلاوے کا انتظار برآمدے میں کر رہا تھا۔ کافی دیر بعد پتاجی نے اسے بلایا۔ اخبار سے نگاہیں ہٹائے بغیر انھوں نے اس کی باتیں سُنیں "ہاں، ہوں" کرتے رہے، اُسے سمجھاتے رہے، لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہ ضد شاید تمھارے خون میں ہے۔

" تم رجنی کے بھائی ہو ـــــــ " میرے بتانے پر پتاجی نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

" اگر میں سرلا دیدی کی سہیلی کا بھائی نہ ہوتا تو آپ مجھ سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہتے ۔" وہ مُسکرایا اور بیٹھ گیا۔

پتاجی نے بھنویں چڑھا کر اس کی طرف دیکھا - گو پتاجی کا رویہ بھی زیادہ خوش گوار یا بہتر نہیں تھا، وہ مِل مالک کی کرسی سے بول رہے تھے، لیکن سونو کا انداز بھی ناپسندیدہ تھا - مَیں نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی - پتاجی نے اُسے اچھی نوکری کا لالچ بھی دیا لیکن وہ ایک ہی بات کہہ رہا تھا ——— کہ وہ اپنے لیے نہیں، مزدوروں کے لیے یہاں آیا تھا، اُن کا نمائندہ بن کر -

" تمھارا کیا خیال ہے، ان دھمکیوں سے ہم ڈر جائیں گے ۔"

" میں نہ تو دھمکی دینے آیا ہوں اور نہ ڈرانے ۔"

" تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو، وہ غیر قانونی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے ۔"

" ضرور ہو سکتا ہے ۔"

" تو بھگت لینا ——— اب تم جا سکتے ہو ۔"

وہ چلا گیا -

" تم ان لوگوں کی مدد کرنے کی بات کر رہے تھے، ان بیہودہ لوگوں کو مکان دینے جا رہے تھے، اس کی ماں کو سلائی مشین دو گے ——— شرد، تم ابھی ٹھیک سے دوست، دشمن میں فرق محسوس نہیں کر سکتے، فیکٹری آیا کرو ——— "

پتاجی چلے گئے -

" دیکھ لیا، کل کا چھوکرا پتاجی کی بے عزتی کر گیا، کیسے پٹاک پٹاک جواب دے رہا تھا، مَیں بات کروں گی رجنی سے ——— " سرلا غصّہ میں تھی - " ہم تو غریب سمجھ کر ان کی مدد کرنا چاہتے تھے اور یہ ——— ہونہہ "

کچھ روز بعد تم مجھے کالج سے آتی ہوئی مل گئیں، تم ٹھیرنا نہیں چاہتی تھیں، کئی بہانے کر ڈالے ——— ٹیوشن، ماں کی دوا - مَیں تقریباً زبردستی تمھیں اپنے ساتھ لے گیا - نہر کی پٹری پر ٹہلتے ہوئے تم نے بہت دیر تک کوئی بات نہیں کی تو مَیں نے کہا:

" یہ سب کیا ہے ——— تم اتنی دُور دُور کیوں ہو ——— "

" پاس تو کھڑی ہوں ۔"

" صرف پاس کھڑے ہونے سے کوئی قریب نہیں ہو جاتا ۔"

" ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے ۔"

" تو تم کم کر و نا ۔"

" ہاں، کم تو ہونا ہی چاہیے ۔" تم پھر چلنے لگیں -

تمھاری یہ پہیلیاں بجھانے کی عادت میری سمجھ سے باہر تھی اور آج بھی ہے - مَیں محسوس کرتا تھا کہ تم مجھے کوئی بُت سمجھ کر توڑنا چاہتی تھیں اور مَیں اپنی حفاظت کرنے پر مجبور تھا اور اس جذبہ نے ہمارے درمیان عجیب سا تناؤ پیدا کر دیا تھا -

" پتاجی سونو کو اچھی نوکری دینا چاہتے تھے ۔"

" خریدنا چاہتے تھے ۔"

"تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" میں تقریباً چیخا۔

"مجھے واپس شہر پہنچا دو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"رجنی، آخر تم کیا چاہتی ہو۔" میں نے نرمی سے کہا: "میں، میری بہن، میرا باپ، میری ماں، سب تمھارے قدموں پر آکر سر رکھ دیں تو خوش ہو جاؤ گی، تم کیا سوچتی ہو، تمھاری اُس گندی گلی کے وجود کا ذمہ دار میں ہوں —— میں اگر تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں تو کیا بُرائی ہے، تم ہر اُس بات کے خلاف ہوتی ہو، جس میں تمھاری بہتری کا پہلو ہو، آخر یہ کیسی سوچ ہے، کون سا فلسفہ ہے، میری تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں، میں سچّے دل سے تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں، ہم سب یہی چاہتے ہیں، مَیں تو تمھاری ماں کے علاج کے لیے فنڈ بھی دلانا چاہتا تھا ——"

"کیا —— ؟" تمھیں جیسے بچھونے ڈنک مارا: تمھارا مُنہ بگڑ گیا تھا "فنڈ، کون گیا تھا تمھارے پاس بھیک مانگنے، کس نے تم سے کہا تھا کہ میری ماں بنا علاج کے مَری جا رہی ہے، کیا سمجھ لیا ہے تم نے ہمیں، بھکاری! بھوکے ننگے کمینے لوگ ہیں ہم!" تم بپھری ہوئی تھیں۔

میں نے تمھارا ہاتھ تھامنا چاہا تو تم نے جھٹک دیا۔

"تم تو لڑنے لگیں۔"

"مَیں لڑ نہیں رہی، پھر تم سے لڑائی بھی کیسی، سر لا آئی اور مجھے بھرے کالج میں ذلیل کر گئی، اب تم آ گئے ہو ——"

"رجنی، آدمی کو پہچاننے کی کوشش کیا کرو۔ تم نے چند مفروضے بنا لیے ہیں، کچھ خانے ہیں تمھارے پاس، جن میں تم لوگوں کو فِٹ کر کے اپنی طرف سے انھیں خوبیاں اور خامیاں دے دیتی ہو اور اُن پر ایمان لے آتی ہو، میں تمھیں سرمایہ دار نظر آتا ہوں، اس لیے تمھارا دشمن ہوں، میں کیا تمھاری طرح انسان نہیں ہوں، میرے دل میں کسی کے لیے ہمدردی، پیار اور محبت کچھ نہیں پیدا ہو سکتا، کیا تم سے محبت کرنے کے لیے میں پہلے گھر چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آؤں، میں اگر تمھیں گھٹن اور سیلن سے نکال کر دھوپ اور روشنی میں لے جانا چاہتا ہوں تو کیا ساتھ تمھارے پڑوسیوں کو بھی لے جاؤں، اگر مَیں چاہتا ہوں کہ تمھارے بھائی بھلے مانسوں کی طرح اچھے کام پر لگ جائیں تو کیا غلط ہے، اگر تمھاری ماں کو اپنی ماں سمجھتا ہوں تو کیا گالی ہے، اس کے لیے پہلے کیا 'انقلاب' لاؤں۔"

تم خاموش رہیں۔

"آج مجھے سمجھا دو، بتا دو کہ تمھارے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"کچھ نہیں ——" تم نے بڑی شانتی سے کہا: "ایک بات کہوں، مشکل یہ ہے کہ ہم جذباتی ہونے لگتے ہیں، سماجی رشتوں کو آپسی رشتوں کی سطح پر لا کر سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، مجھے تمھاری نیکی، شرافت، خلوص اور محبت کسی پر شک نہیں، لیکن جب تم کسی سنستھا کی طرف سے مدد دینے کی بات کرتے ہو تو میرے دل و دماغ پر چوٹ پڑتی ہے، میرے اصول ٹوٹتے ہیں، جب تم میرے بھائی کو اچھی سی نوکری دے دو گے، میری بیوہ ماں کو سلائی مشین اور علاج کے لیے فنڈ دے دو گے اور مجھے کسی نہ کسی طرح صاف ستھرے مکان میں پہنچا دو گے تو جانتے ہو کیا ہوگا —— ہم سب اپنی نظروں میں گر جائیں گے۔ تم اسے ہمدردی کہتے ہو، میں اسے دشمنی سمجھتی ہوں۔ یہ جو سیوا سنستھائیں بنائی جاتی ہیں، یہ سرمایہ داروں کی انا کی تسکین کا ذریعہ ہیں، یہ اُس طوفان، اُس انقلاب کی راہ میں رُکاوٹ ہیں جو گندی گلیوں میں جنم لے

رہا ہے۔ میری ماں بنا علاج کے مر جائے کہ میرا بھائی سرمایہ داروں کی پولیس کے ظلم کا نشانہ بن جائے، میں رہوں یا نہ رہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ——— میں چاہتی ہوں ہم پر یہ ظلم بڑھے۔ ہماری یہ ٹریجڈی اس انقلاب کی رفتار کو تیز کرے گی۔ اس دیش کو ابھی ایک اور مہابھارت کی ضرورت ہے۔"

"تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔"

"کوئی راستہ ہے تو سہی۔"

تمھارے لہجے کی تلخی اور کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم لوٹ آئے۔ جب میں نے تمھیں گلی کے باہر الوداع کہی تو تم خاموش تھیں۔

"ماں سے کہنا میں ملنے آؤں گا۔"

"نہیں، آپ نہیں آئیں گے، محلّے کے لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں اور ہمیں وہاں رہنا ہے، عزت اور اطمینان سے، پھر آپ ماں کے زخم کریدنے کے سوا اور کریں گے بھی کیا، ماں پہلے ہی بہت دکھی ہے اور کبھی کبھی مجھ سے بھی زیادہ کڑوی بات کہہ جاتی ہے۔"

"کڑواہٹ کا تم نے عادی بنا دیا ہے۔"

"خیر، آپ آئیں گے نہیں۔"

"یوں دروازے بند کر لینے سے آدمی دھوپ اور روشنی سے خود کو محروم کر لیتا ہے، فضا کو زہریلی کر لیتا ہے۔"

"دیکھیے، سرلا میرے بھائی کی شکایت لے کر آئی تھی، آپ بھی اسی لیے مجھے اتنی دور لے گئے تھے، میں تو آپ لوگوں کے پاس کوئی شکایت لے کر نہیں گئی، میں اگر بتاؤں کہ آپ کے پتا جی نے ہم پر کتنا اوچھا وار کیا ہے تو شاید آپ برداشت نہ کر پائیں گے۔"

"کیا کیا ہے انھوں نے؟ سونو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، اسے غلط راستے سے ہٹانا چاہا تھا، وہ تم لوگوں کو بھی اپنے بچّوں کی طرح سمجھتے ہیں۔"

"آپ سن نہیں سکیں گے۔"

"سن لوں گا۔"

"آپ کے پتا جی نے میری ماں کو نوکری سے نکلوا دیا ہے، کیوں کہ وہ اسکول کی مینیجنگ کمیٹی کے چیئرمین ہیں، خیر اس کا مجھے کوئی دکھ نہیں، ایسا ہوتا آیا ہے، دکھ تو اس بات کا ہے کہ انھوں نے اس بوڑھی عورت پر جھوٹا الزام لگایا ہے، بے ایمانی، چوری اور غبن کا، وہ سونو کا بدلہ ماں سے لے رہے ہیں، اس سب کی کیا ضرورت تھی، اگر ان میں ذرا بھی حوصلہ تھا تو صاف صاف کہتے کہ کیوں نکال رہے ہیں، لیکن اُن میں اتنی جرأت نہیں ہے، اُن سے جا کر کہہ دیجیے گا کہ ہر آدمی بکاؤ نہیں ہوتا۔"

"میں ان سے بات کروں گا۔"

"میں نہ تو وکالت کر رہی ہوں اور نہ کوئی سودا، صرف سچائی بتا رہی ہوں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔"

میں لوٹ آیا۔

تم نے کالج چھوڑ کر نوکری کرلی۔ ہم لوگ سرلا کی شادی میں مصروف ہو گئے اس کی شادی پر تم صرف مبارکباد دینے آئیں، واپسی پر کوٹھی کے باہر میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔

"کارڈ میں نے بھیجا تھا۔"

"کالج فیس دینے بھی آپ گئے تھے۔"

"ہاں، ایم۔اے کرلو۔"

"اب نہیں، ممکن ہی نہیں رہا۔"

"میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تم سے ڈر سا لگنے لگا ہے، ذرا سی بات پر تمھاری انا مجروح ہوتی ہے، تمھیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔"

تم مسکرادیں۔ وہ مسکراہٹ جو مجھے جھنجھلا دیتی ہے۔ میں چڑ گیا۔ تم چلی گئیں۔

وقت گزرتا رہا۔ میں نے کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ دن بھر فیکٹری میں، رات دیر تک کلب میں۔ کبھی کبھار کیلاش آوارہ گردوں کی ٹولی میں دکھائی دے جاتا۔ کبھی فلموں کے اشتہار لگاتے ہوئے، کبھی کوئی اور ایسا ہی گھٹیا کام کرتے ہوئے۔ پھر اُسے ہتھکڑی لگی بھی دیکھی، اس نے کسی کو چاقو مار دیا تھا۔

تب ہی ایک دوپہر کو خبر ملی کہ تمھاری ماں چل بسی تھی۔ خبر بھی عجیب طرح سے ملی تھی۔ میں ایک رشتہ دار کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال گیا تھا، لوٹا تو جنرل وارڈ کی دیوار سے لگ کر روتے سونو کو دیکھا، تمھیں چند عورتوں نے سنبھال رکھا تھا، کیلاش ایک پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑا تھا۔ میں نے جا کر سونو کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ میرے سینے سے لگ کر پھپھک کر رو دیا۔ اُس نے سسکیوں کے بیچ بتایا کہ ماں کچھ دیر پہلے مر گئی تھی۔ میں تمھارے پاس گیا۔ تم سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

پھر میں تمھارے گھر گیا۔ سیلن زدہ، بدبودار دیوار کے سہارے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ سب چلے گئے، تم بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں، میں لوٹ آیا۔

کیلاش نہ جانے کہاں چلا گیا۔ سونو یونین کے چکر میں تھا۔ ایک شام وہ مزدوروں کے ایک جلوس کی اگوائی کرتا نظر آگیا۔ پولیس بہت زیادہ تعداد میں تھی۔ ٹیر گیس پھینکی گئی، لاٹھی چارج ہوا، سونو جھنڈا لیے ادھر اُدھر بھاگتا رہا، آخر لاٹھی کھا کر وہ بھی گر پڑا۔ اسے ہتھکڑی لگا کر تھانے لے گئے۔ میں سیدھا تمھارے پاس پہنچا۔ تمھیں تمام حالات سے آگاہ کیا، تم مسکرادیں۔

"یہ تمھاری حکومت کا سوشلزم ہے جہاں اپنا حق مانگنے والوں کے سر پھاڑ دیے جاتے ہیں، اُنھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔"

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے، ایس۔ایس۔پی میرا دوست ہے، میں کسی نہ کسی طرح سونو کو چھڑا لوں گا، تم میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں، سونو کے ساتھ اور بھی بہت سے نوجوان ہیں، اُسے اُن کے ساتھ ہی رہنے دو، میں نہیں چاہتی کہ کوئی اُسے کمینہ، کمزور اور بزدل کہے، وہ غدار نہیں بنے گا۔ ہم لوگوں کا خون اسی لیے ہوتا ہے، تمھارے چراغوں میں جلے یا تمھاری راہوں میں بہے۔"

میں مایوس اور بجھا بجھا سا لوٹ آیا۔

پھر تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔
پتاجی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ ہر نیا بجیٹ انھیں لاکھوں دے جاتا اب وہ برلا، ٹاٹا بننے کی سوچ رہے تھے، کارخانے، فیکٹریاں، سودے، بلیک، رشوت، ذخیرہ اندوزی —— بمبئی جاکر فلموں کا چکر —— وہاں سے ناکام لوٹے تو ناکامی ساتھ چلی آئی۔ جلدی ہی سب ختم ہوگیا، اس صدمہ سے اپنا دماغی توازن تقریباً کھو بیٹھے۔ اب انھیں پوجا، دیوی، دیوتا اور جیوتشیوں کا چسکا ہوگیا تھا اور آخر ایک تیرتھ یاترا کے دوران پتاجی اور ماں دونوں ریل حادثہ کا شکار ہوگئے۔
تمھاری خبر ملتی تو دل کو اور بھی دکھ ہوتا۔ کیلاش لاپتہ تھا، سونو انڈر گراؤنڈ اور تم اکیلی، معلوم ہوا پولیس تمھیں بھی تنگ کرنے لگی تھی۔ میں آخر تم سے ملنے گیا۔ تم بہت اُداس اور پریشان تھیں۔
"یہ سب کیا چکر ہے، پولیس والے تمھیں کیوں بار بار تنگ کرتے ہیں۔"
"یہ تو وہی جانیں، لیکن میں سونو کو کہاں سے لے آؤں، مہینوں سے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"
"اب تو سمجھ گئیں کہ جن سے تم ٹکر لے رہی ہو وہ بہت بڑی طاقت کے مالک ہیں۔ پولیس، فوج، قانون —— سب ان کے ساتھ ہیں۔ اس طاقت سے ٹکرانے کے لیے اس سے بھی بڑی طاقت پیدا کرو۔"
"یہ مجھے اکیلی دیکھ کر بے عزت کر رہے ہیں۔"
"تم لکھ کر دے دو کہ تمھارا سونو کی ذات، اس کے سیاسی خیالات یا تعلقات سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہے، یہ میں ایس۔ ایس۔ پی کے کہنے پر کہہ رہا ہوں۔"
اُس وقت تمھارے چہرے پر رنگ تیزی سے بدل رہے تھے، جیسے تمھارے سینے میں طوفان اُٹھ رہا ہو، جیسے تم اپنے آپ سے لڑ رہی ہو۔
"میں سوچ کر جواب دوں گی۔"
پھر تم میرے گھر آئیں اور گیتانجلی میز پر رکھ کر چلی گئیں۔ شہر چھوڑ کر۔

۳

باہر دن کا اجالا پھیل رہا ہے۔ وہ بمبئی میں ہو تو میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا اور ہم نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے۔
جو ہو کے آس پاس نہیں ملی۔ آخر ایک دن عورتوں کے جلوس کی رہ نمائی کرتی نظر آگئی۔ میں جلوس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ جب جلوس منتشر ہوا تو میں اُس کے قریب گیا۔
"تم نے پہچانا مجھے۔"
وہ خاموش رہی، تھکی تھکی اور بیمار لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ لیا۔
"شور مچاؤ، لوگوں کو پکارو اور مجھے پٹواؤ۔"
وہ مسکرا دی۔
"شرد، پلیز مجھے پریشان مت کرو۔"
"میں اب تمھارے پیر پکڑ لوں گا، تمھیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"یہ کیا بچپنا ہے ——— چلو گھر چلو، یہاں ———"

وہ بریلی کی ایک خستہ حال عمارت کی ایک کھولی میں رہ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا، وہ سیلن زدہ، بدبودار گھر اس کے پیچھے وہاں بھی آگیا تھا۔ فرش پر تقریباً آدھے کمرے میں دری بچھی تھی۔ ایک طرف چند کتابیں قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک کونے میں اسٹوو، برتن اور دیگر سامان پڑا تھا۔

"چائے پیوگے۔"

"ضرور۔"

وہ چائے بنانے لگی، میں کتابیں دیکھنے لگا۔ بیچ بیچ میں ہم ایک آدھ بات کر لیتے، اتنا طویل ماضی اور ہمارے پاس کہنے سننے کو بہت کم تھا۔ میں دیکھ رہا تھا وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔

"اے میڈم، اب تم یہاں نہیں رہوگی، میرے ساتھ چل رہی ہو، ابھی، اسی وقت۔ اب تم آرام کرو، بہت ہو لیا انقلاب زندہ باد، ہم چل کر انقلاب لائیں گے، پہلے اپنی زندگی میں پھر ———" میں نے اٹھ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔ میں اس ڈر کو ختم کر دینا چاہتا تھا، جو اس کی شخصیت نے پیدا کر دیا تھا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"جو پہلے کرنا چاہیے تھا ———" میں نے کہا: "اٹھا کر لے جا رہا ہوں۔"

"لیکن بابا، میں نہیں جا سکتی۔"

میں اس کے لبوں پر جھک گیا۔

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"بس نہیں۔"

"اب تمھاری ضد نہیں چلے گی۔"

"نہیں شرد، آج میں کتنی خوش ہوں، تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پہلی بار آج تم نے مجھ پر اپنا حق سمجھا ہے، پہلے تم ڈرتے رہے، کتراتے رہے، میں تو سدا سے تمھاری تھی، لیکن تم نے کبھی اپنا حق ہی نہیں جتایا ——— لیکن اب۔"

وہ ایک دم اداس ہو گئی۔

"دیکھو رجنی، میں چیخ چیخ کر لوگوں سے دوبارہ کہوں گا کہ تم میری بیوی ہو، گھر سے لڑ کر آگئی ہو، اس پر بھی تم میرے ساتھ نہیں گئیں تو تمھاری چوکھٹ پر سر پھوڑ لوں گا۔"

میں نے دوبارہ اسے اپنی طرف کھینچا تو اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ پیشانی پسینے سے بھیگ گئی، گلے کی رگیں پھول گئیں، سانس اکھڑ گئی اور وہ سینہ دونوں ہاتھوں سے دبا کر میری بانہوں میں لڑھک گئی، رنگ ایک دم گہرا سیاہ ہو گیا، آنکھیں ابل آئیں۔ میں ایک دم بہت خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مند گئیں، جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اور وہ لمبے لمبے، تھکے تھکے سانس لینے لگی تھی۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے، کہہ دو میرا شک غلط ہے، چلو میرے ساتھ، ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔"

کئی منٹ کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تو مسکرا دی۔ وہ اس حالت میں بھی مسکرا سکتی تھی۔

"اس طرح میں تمہارے ساتھ چل دی تو چال والے کہیں گے، بھاگ گئی عاشق کے ساتھ۔ میں نے جو کام شروع کر رکھا ہے اسے کسی کو سونپ دوں —— کچھ دن لگیں گے ——"

"اچھا میں اب آتا رہوں گا۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

میں روز شام کو جانے لگا۔ وہ اپنی ایک ساتھی کو کام سمجھا رہی تھی۔ وہ سب خوش تھیں کہ رجنی اپنا گھر بسا رہی ہے۔ انھوں نے باقاعدہ ہماری شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں تھیں کہ اچانک مجھے کمپنی کے ڈائریکٹر کے ساتھ دَورے پر جانا پڑا۔ لمبا چوڑا ٹور تھا۔ ہر شہر سے میں رجنی کو خط لکھتا رہا۔

جب تقریباً دو مہینے بعد میں لوٹا تو سیدھا رجنی کی کھولی پر پہنچا۔ وہاں دوسری عورت رہ رہی تھی۔ اس سے رجنی کے بارے میں پوچھا تو وہ منہ لٹکا کر بولی:

"وہ پنجاب کا بائی، بڑا اچھا تھا، مرگیا بے چارہ۔ ہفتہ بھر کبھار آیا اور مرگیا، اُس کا کچھ چیز ادھر پڑا ہے۔"
وہ اندر سے رجنی کا تھیلا اور ایک بند لفافہ اٹھا لائی۔

میں مشکل سے اپنے آنسو روکتا ہوا باہر سڑک پر آیا۔ لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ ایک سطر لکھی تھی:
"جا رہی ہوں، معاف کرنا، اگلے جنم میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

پیاسی جھیل

"پیاسی جھیل" کی پرمندر کور اِس افسانے کے منظر نامہ کی اصل روح ہے ــــــ منظر نامہ : ڈلہوزی کے فطری حسن کا کینوس پہاڑوں کی شادابی، درختوں کی گھنی چھاؤں اندھیرے اُجالے اور دُھند کے۔ برف پوش کہساروں کا قرب اور خودرو جنگلی پھولوں کی کائنات۔ میدانی علاقوں سے آنے والوں کے لیے تفریح، وابستگی اور آسودگی کی کائنات ــــــ پرمندر کور اور امر سنگھ کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ بھی موسموں کی شدت سے بچ کر ڈلہوزی کے پُرفضا فطری ماحول میں وقت گزارنے والے سیاحوں، اور ڈلہوزی کے درمیان رشتے کے مماثل ہے۔

پرمندر کور نے تمام افسانے میں مکالمے بہت کم ادا کیے ہیں۔ اُس کا وجود ابتدا سے انتہا تک، ایک جستجو، ایک تجسس، ایک تصادم، ایک مزاحمت، اور ایک نوع کی خاموش بغاوت کا مظہر ہے۔ پرمندر کور صرف ایک عورت نہیں ، ایک جمالیاتی قدر ہے، ایک علامت ہے، جس کا مفہوم، پورے آدمی کی جستجو ہے ــــــ وہ آدمی جو عُریاں تصویروں اور شراب کے نشے میں صرف عورت کے جسم کا ہی متلاشی نہ ہو بلکہ اُس کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے روح کے سرابوں کی بھی سیاحی کر سکے۔

پرمندر کور وہ دھرتی ہے، جس میں دریاؤں کی خاموشی اور نیلے پانیوں کی جھیلوں کی گہرائی ہے، جس میں فطرت کا تمام ارتقائی عمل ہے ــــــ جس میں جنگل ہیں ــــــ پہاڑ ہیں ــــــ افق تک پھیلے ہوئے اسرار ہیں، اور ہر اِسرار کے پس پُشت مفاہیم اور

اشیاء کی ایک نئی اور ان دیکھی کائنات ہے۔

پرمندر کور اس دھرتی کی فطرت ہے، جو خاموشی میں ہزاروں سوال کرتی ہے، جو راتوں کو اس لیے جاگتی ہے کہ پھول کو کھلتے دیکھ سکے، اور جب وہ صبح کی آغوش میں شگفتہ پھولوں کو دیکھتی ہے تو خیالات کی وادیوں میں کھو جاتی ہے۔ وہ چیل کے جنگلوں اور ان پر طاری سکوت میں زندگی کی وسعتیں، اور شعری صداقتیں تلاش کرتی ہے۔

"پیاسی جھیل" کی پرمندر کور اس افسانے میں، صرف ایک مرحلے پر، اپنے وجود اور اپنی شخصیت اور اپنی آزادی کا اظہار کرتی ہے، جب وہ ڈلہوزی سے لکڑ منڈی جاتے ہوئے جنگلوں اور درختوں کی بکھری پڑی فضا میں، زندگی سے ایک نیا اور لمحاتی رشتہ محسوس کرتی ہے —— تب اسے اپنے شوہر اور اپنے محبوب کے درمیان، اپنی وابستگی اور ہم رشتگی کے اظہار کا ایک لمحہ میسر آتا ہے —— سماجی ضابطوں اور اخلاقیات سے آزاد ہو کر، وہ بے محابا، اپنے احساس اور جذبات کا اظہار کرتی ہے —— خاموش فضاؤں سے ہم کلام ہوتی ہے، اور احساسِ آزادی اور احساسِ وابستگی کے اس لمحہ میں اسے جنگلوں کے درخت، جاندار اور جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں، زندگی سے یہی ہمہ گیر وابستگی پرمندر کور کا مسئلہ ہے —— پریم کا کردار، پرمندر کور کے لیے اسی ہمہ گیری کا ایک وسیلہ ہے —— امر سنگھ کا غیر فطری اسلوب، زندگی اور مکمل زندگی سے وابستگی کی راہ کا رخنہ ہے —— پرمندر اس رکاوٹ کے خلاف خاموش احتجاج میں مصروف ہے لیکن پریم کے روپ میں اسے ایک اور رخنہ اور غیر مکمل کردار کا واہمہ نظر آتا ہے —— پریم وہ چاہتا ہے، جو امر سنگھ کو کسی آرزو کے بغیر پرمندر کے روپ میں دستیاب ہو جاتا ہے —— اور پرمندر کور چاہتی ہے کہ وہ "ڈلہوزی" کی طرح محض ایک پرفضا اور لمحاتی آسودگی کی منزل نہ ہو بلکہ ایک ایسی منزل، ایسی جستجو، ایسی تلاش ہو، جو مسلسل سفر کا وسیلہ بنتی ہے۔ پرمندر کور کو مسلسل سفر سے، نئے سے نئے اور انوکھے تجربات اور مقامات سے دلچسپی ہے۔ اور پریم کی منزل صرف ایک جسم اور اس جسم کے کچھ مخصوص مقامات ہیں۔

پرمندر کور اس افسانے میں اس لمحاتی اور عارضی وابستگی کے خلاف احتجاج کی علامت ہے، جو فطرت کے حسین مناظر والے شاداب مقامات کو، سیاحوں کے لیے آسائش اور عیاشی کے مواقع فراہم کرتی ہے —— پرمندر کور، مجسم اور مکمل وابستگی کے مفہوم کو ادا کرنے والی علامت کے طور پر "پیاسی جھیل" کا اصل اور مکمل محور ہے۔

محمود ہاشمی

ڈلھوزی میں پریم کو دو چیزوں نے بیحد متاثر کیا تھا: ایک تو ان زرد پھولوں نے جو ہر موڑ پر مسکراتے ہوئے سامنے آ جاتے تھے؛ دوسری پرمندر کور کی بڑی بڑی اُداس آنکھوں نے جنھیں دیکھ کر اسے ان ویران مندروں کا خیال آنے لگتا جن میں کبھی چراغ نہ جلائے گئے ہوں۔

پریم وہاں اپنے دوست سریندر کی کوٹھی میں ٹھیرا تھا جس کی نچلی منزل میں پرمندر رہ رہی تھی۔ اس کا خاوند، امر سنگھ، امرتسر میں کریانے اور ڈرائی فروٹس کا کاروبار کرتا تھا اور ان سکھوں میں سے تھا جو داڑھی مونچھ کے بال بھی کترتے ہیں اور پانچوں ک بھی سجائے رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ایک انچ کی کرپان دو انچ کے کنگھے میں فٹ تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ کڑا اور کچھا بھی اسی میں فٹ کرا لیتا۔

پہلے دن جب پریم اوپر کمرے میں اپنا سامان کھلوا رہا تھا امر سنگھ آ گیا۔ معمولی سے تعارف کے بعد ان کے درمیان رسمی سی گفتگو ہوئی اور امر سنگھ واپس چلا گیا۔ تین چار دن وہ عام پڑوسیوں کی طرح ملتے رہے۔ رسماً دعا سلام ہوتی، خیر و عافیت پوچھی جاتی، پرمندر ایک بار اس کی طرف دیکھتی اور فوراً نظریں جھکا لیتی۔ پریم نے اسے زیادہ تر پڑھتے یا نٹنگ میں محو دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے سڑک پر اکیلی بھی مل جاتی، لیکن بات نہ ہوتی۔ وہ اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے پہرے میں ہوں اور انھیں بات کرنے کی ممانعت ہو۔

ایک سہ پہر پریم کمرے میں بیٹھا اس کوئلے والی کی تصویر کو آخری ٹچ دے رہا تھا جسے وہ روز بکرد یے کی طرف سے پیٹھ پر کوئلوں کی ٹوکری لادے آتے دیکھا کرتا تھا کہ امر سنگھ آ گیا۔ ایزل پر تصویر دیکھ کر اس نے حیرت سے پریم کی طرف دیکھا، پھر تصویر کی طرف دیکھا اور پھر پریم کی انگلیوں پر لگے سیاہ رنگ کو دیکھنے لگا۔ پریم کو امر سنگھ کا یہ انداز کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر کہا:

"آیئے، کیسے تکلیف کی؟"

"تو آپ آرٹسٹ بھی ہیں!" امر سنگھ یہ بھول ہی گیا کہ وہ وہاں فاؤنٹن پن اِنک لینے آیا تھا۔ "واہ بھئی! ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔" وہ کھلی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ "ویسے میں نے آپ کی داڑھی دیکھ کر سوچا تھا کہ آپ آرٹسٹ ہوں گے۔"

"اس لحاظ سے تو آپ بہت بڑے آرٹسٹ ہوئے۔"

امر سنگھ اس مذاق پر خوب ہنسا۔ وہ خط وغیرہ بھول کر وہیں کشن پر بیٹھ گیا اور تصویر کو غور سے دیکھ کر بولا:

"یہ کسی کوئلے والی کی تصویر ہے۔ پر اس بوڑھی عورت کی تصویر بنانے سے

فائدہ! ادھر سے ایک لڑکی گزرتی ہے۔ بڑی Best چیز ہے۔ اس کی تصویر بناؤ۔"

پریم خاموش رہا۔ امرسنگھ اسے اپنے ایک آرٹسٹ دوست کے بارے میں بتانے لگا جو بمبئی میں رہتا تھا۔ جس کا Studio بہت شاندار ہے۔ اس کا اپنا بنگلا اور کار ہے اور ایک خوبصورت لیڈی سیکریٹری ہے۔ آخر میں اس نے زور دے کر کہا:

"بڑی Best تصویریں بناتا ہے۔"

پریم کے انکار کے باوجود وہ اسے اپنے ساتھ نیچے لے گیا۔ پرمندر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ رسمی سا تعارف ہوا اور امرسنگھ نے بیوی کو چائے تیار کرنے کے لیے کہا۔ پریم نے میز سے وہ کتاب اٹھالی جو پرمندر چھوڑ گئی تھی۔ ہندی گیتوں کا مجموعہ تھا۔ ہلکے پھلکے رومانٹک گیت تھے، اس برہن کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جس کا پریتم پردیس جاکر اسے بھول گیا تھا۔ کتاب رکھ کر پریم کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ آرائش سے سلیقہ اور ذوقِ سلیم ظاہر تھا۔ میزپوش سے لے کر ریڈیو تک ہر چیز قیمتی تھی۔ اس نے امرسنگھ کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ پریم کو متوجہ پاکر وہ پھر اس آرٹسٹ اور اس کی سیکریٹری کا ذکر کرنے لگا۔ پریم نے محسوس کیا کہ اس شخص کو آرٹ سے زیادہ آرٹسٹ اور اس کی سیکریٹری میں دلچسپی ہے۔

چائے خاصی پرتکلف تھی۔ جب پرمندر پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی امرسنگھ اس ٹی سیٹ کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ انگلش ہے اور اس نے کلکتے سے خریدا تھا۔ پھر وہ اسے الماری میں رکھے جاپانی Transister اور Titoni گھڑی کے بارے میں بتانے لگا جو اس نے کلکتے کے ایک اسمگلر سے خریدی تھی۔

"اپنا یار بن گیا ہے۔ جو چیز چاہو لے لو۔ اس کے پاس لڑکیاں ہیں جو ہانگ کانگ سے مال لاتی ہیں۔ کسٹم والے واقف ہیں۔ شہر کا کوئی پولیس افسر نہیں جو اس کی کوٹھی پر نہ آتا ہو۔ بڑا Best آدمی ہے۔"

پرمندر خاموش بیٹھی تھی، جیسے اسے کسی بات میں دلچسپی نہ ہو۔ کبھی کبھی وہ کوئی پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دیتی۔ ایک ثانیہ کو امرسنگھ سے بچا کر پریم اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا اور اسے وہ زرد پھول یاد آنے لگتے جو ہر موڑ پر راستہ روک لیتے تھے۔

اس شام وہ اکٹھے سیر کرنے گئے۔ پرمندر ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی جیسے ساتھ نہیں تھی۔ وہ باتیں کرتے آگے نکل جاتے، پریم پلٹ کر دیکھتا اور ٹھہر جاتا۔ امرسنگھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہتا: "آجائے گی۔" اور باتیں شروع کر دیتا۔ وہ اسے ڈلہوزی کے تمام قابلِ دید مقامات کے بارے میں بتاتا رہا اور پروگرام بناتا رہا کہ وہ کب کہاں جائیں گے۔ پریم سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ امرسنگھ ایک دم اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا ہے۔

امرسنگھ نے اپنے ہر ملنے والے سے پریم کا تعارف بڑے زوردار الفاظ میں کرایا۔ وہ ہر شخص سے کہتا: "یہ ہندستان کے عظیم آرٹسٹ ہیں۔ ان کی تصویروں کو کئی انعام مل چکے ہیں۔ اب ان کی تصویروں کی نمائش پیرس میں ہونے والی ہے۔ دلّی، بمبئی کے بڑے بڑے افسر، سیٹھ اور فلم لائن کے آدمی ان کے واقف ہیں۔" پریم تمام وقت بے وقوف بنا کھڑا رہتا اور امرسنگھ اس طرح اسے دیکھتا جیسے منڈی میں فروخت کی غرض سے آیا ہوا دیہاتی اپنی بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ پریم نے محسوس کیا کہ ان تمام باتوں اور تعریفی جملوں سے امرسنگھ کو اس کی عزت افزائی مقصود نہیں، وہ تو صرف اپنے ملنے جلنے والوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہندستان کا ایک عظیم فنکار اس کا دوست ہے۔

واپسی پر اس نے امرسنگھ سے کہا: "آپ کو غلط نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"وہ کیا کسی سے پوچھنے جائیں گے؟ اس طرح ذرا ٹھاٹھ بنا رہتا ہے۔"
پریم نے کچھ نہیں کہا، اس کی گھنی داڑھی مونچھوں کو دیکھنے لگا جن میں اس کے چہرے کے نقوش کہیں گم ہو گئے تھے۔

اب اکثر ایسا ہوتا کہ امر سنگھ اس کے پاس اوپر آ بیٹھتا یا اسے نیچے بلا لیتا اور بڑی تفصیل سے وہ تمام واقعات سنانے لگتا جو اس کے ساتھ سفر میں پیش آئے تھے۔ اس نے کوئی ایسا سفر نہیں کیا تھا جس میں اسے ایک آدھ لڑکی نہ ملی ہو۔ وہ ان تمام ولایتی شرابوں کے نام گنواتا جو اس نے پی تھیں۔ اسے فخر تھا کہ وہ بمبئی جیسے Dry شہر میں بھی جب چاہے شراب حاصل کر سکتا تھا پرمندر کی موجودگی میں وہ صرف شراب کا ذکر کرتا۔ لڑکیوں کا ذکر آتا تو وہ مسکرا کر کہتا: "ستر سال پرانی شراب تھی۔" یا "تیس سال پرانی تھی۔ بوتل فسٹ کلاس۔ لیبل لگا ہوا سیل ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔" اور آنکھ مارتا۔ پریم سمجھ جاتا۔ پرمندر خالی سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی۔ پریم چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرے۔ وہ جان بوجھ کر ایسے موضوع شروع کر دیتا جن پر وہ بول سکے، لیکن وہ خاموش رہتی۔ پریم کو اکتاہٹ ہونے لگتی اور وہ وہاں سے اٹھ جانے کے بہانے تلاش کرنے لگتا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ پرمندر اسے باہر کہیں مل گئی، اس نے بات کی اور وہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس پر عجیب سا خوف طاری ہو جاتا۔ وہ دو چار باتیں کرتا، وہ نہایت ٹھنڈے جواب دیتی۔ اسے خاموش کھڑے دیکھ کر پریم کو وہ پہاڑ یاد آنے لگتے جن پر سارا سال برف جمی رہتی ہے۔ وہ سوچتا اسے بازوؤں سے پکڑ کر اتنا جھنجھوڑے، اتنا جھنجھوڑے کہ وہ پھٹ پڑے، اس کے گرد کھڑی برف کی دیوار اچھل کر گر پڑے۔

ایک دن وہ اپنے کمرے کے باہر بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ اسے سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی تو اٹھ کر اندر چلا گیا۔ سگریٹ لے کر نکلا تو اس کی نظر پرمندر پر پڑی۔ وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑی محویت کے عالم میں تصویر کو دیکھ رہی تھی — وہ ایک سیکنڈ کے لیے دہلیز پر رکا، پھر باہر آ گیا۔ پرمندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

"پسند آئی آپ کو؟"

اس کے لبوں میں معمولی سی حرکت ہوئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور پانو پر بوجھ بدل کر کھڑی رہی۔ پریم نے محسوس کیا کہ وہ چاہ کر بھی نظریں نہیں اٹھا پا رہی۔ وہ ساری میں لپٹے اس کے متناسب جسم کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے تمام دنیا کہیں کھو گئی، صرف پرمندر رہ گئی۔ اس کے جی میں آیا اسے بانہوں میں بھر کر لب اس کی آنکھوں پر رکھ دے۔ پھر جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کے سراپے سے نظریں ہٹا کر بولا:

"بیٹھیے۔"

"جی، وہ —— وہ ——"

نیچے امر سنگھ کی آواز سنائی دی۔ وہ نوکر کو ڈانٹ رہا تھا۔ پرمندر نے پریم کی طرف دیکھا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ کھڑا سیڑھیوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پرمندر کی آخری نظریں اس کے ذہن کے پردے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے ان آنکھوں میں کچھ پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا اور تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔

دوسرے دن سہ پہر کے قریب آسمان پر بادل گھر آئے۔ امر سنگھ نے پریم کو نیچے بلا لیا۔ پرمندر صوفے کے کونے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ پریم سے نظریں ملیں تو اس کا چہرہ ایک دم گلابی ہو گیا۔ وہ کتاب رکھ کر اندر چلی گئی۔ پریم نے کتاب اٹھائی۔ سکاٹ کی Ivanhoe تھی۔ امر سنگھ پینے کے موڈ میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بوتل وہیں منگائی جائے اور

اطمینان سے بیٹھ کر پی جائے۔ پریم باہر پینا پسند کرتا تھا۔ امر سنگھ نے الماری سے سولن کی بوتل نکالی۔ اس میں دو ڈھائی پیگ کے قریب بچی تھی۔

"پی کر ہی چلتے ہیں۔" امر سنگھ نے بوتل میز پر رکھ دی اور نوکر سے گلاس اور پانی لانے کے لیے کہا۔ "اس وقت سوڈے کا انتظار نہیں ہو سکتا۔"

گلاسوں میں انڈیل کر اس نے بوتل فرش پر لڑھکا دی۔ گلاس ٹکرائے اور اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"ختم کرو جلدی سے۔"

پریم آہستہ آہستہ پینے کا عادی تھا۔ اس نے تھوڑی سی حلق میں اُتار کر کہا: "شراب اور عورت کے معاملے میں جلدبازی نہیں کرنی چاہیے۔"

"ہائے! کیا بات کہہ دی۔ جیو راجا۔" امر سنگھ شرابیوں کی طرح بولنے لگا۔ "جانی! تمھیں ایک چیز دکھاؤں، زندگی بھر یاد کرو گے۔" وہ جا کر الماری میں سے ایک لفافہ نکال لایا اور اس میں سے تصویریں نکال کر پریم کے سامنے میز پر پھیلا دیں۔

وہ سب کی سب ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ جسم کی گھٹیا نمائش اور لذتیت کے سوا ان میں کچھ نہیں تھا۔ پریم نے تصویریں لفافے میں رکھ دیں اور سگریٹ سلگا لیا۔

"یہ تصویریں عورت کو دکھا کر بڑا مزہ آتا ہے۔" امر سنگھ نے کہا۔ اس کے لبوں پر غلیظ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو پریم کو سنجیدہ پا کر کہیں مونچھوں میں ہی گم ہو گئی۔ اس نے اُٹھ کر لفافہ الماری میں رکھا اور کوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ "آؤ چلیں۔"

بارش کے ڈر سے بہت کم لوگ سیر کے لیے نکلے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کوٹھیوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ شیشوں سے روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ امر سنگھ نے پھر لڑکیوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ ایک مدراسن کی بات کر رہا تھا جو ہندستانی بالکل نہیں جانتی تھی اور امر سنگھ اس کی بولی سے قطعاً ناواقف تھا لیکن پھر بھی وہ ساری رات اکٹھے رہے۔

"تم بور نہیں ہو گئے؟" پریم نے حیرت سے پوچھا۔

"بور؟ کیوں؟" وہ ہنسا۔ "وہ تو مدراسن تھی۔ دلّی میں مجھے ایک لڑکی مل گئی جو گونگی اور بہری تھی۔ میں اسے گالیاں دیتا رہا، وہ ہنستی رہی۔ بڑا مزہ آیا۔"

پریم کو لمحے کے لیے احساس ہوا کہ وہ انسان کے ساتھ نہیں درندے کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کی شراب پانی ہو گئی۔ اس کے بعد امر سنگھ نے اسے کتنا ہی مجبور کیا وہ اس کے ساتھ پینے پر راضی نہیں ہوا۔ اس رات وہ دیر تک کھڑکی میں کھڑا روشنی کی اس مستطیل کو دیکھتا رہا جو امر سنگھ کے کمرے کے باہر بن گئی تھی۔ بار بار اسے اس گونگی لڑکی کا خیال آ جاتا جسے امر سنگھ نے گندی گالیاں دے کر مزہ لیا تھا۔ وہ اس واقعے کو ذہن سے جھٹکتا تو اسے پرمندر کا خیال آ جاتا اور اس کے ذہن میں اس ریچھ کی کہانی تازہ ہو جاتی جو جنگل میں لکڑیاں تلاش کرتی ایک عورت کو اُٹھا لے گیا تھا۔ کہانی سُنا کر لکڑہارے نے کہا تھا: "بابو جی ریچھ بڑا حرامی ہوتا ہے، نہ عورت کو مارتا ہے نہ چھوڑتا ہے۔"

دو تین روز وہ امر سنگھ سے نہیں ملا۔ اوپر کے راستے سے ہی نکل جاتا اور ان راستوں پر سیر کرتا رہتا جدھر امر سنگھ کے آنے کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دیر تک پرمندر کے بارے میں سوچتا رہتا کہ وہ کیسے اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہے، لیکن پرمندر کے لبوں پر حرفِ شکایت ایک مرتبہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ عام ہندستانی بیویوں کی طرح رہ رہی تھی، جیسے گہرا دریا خاموشی سے اپنے کناروں کے درمیان بہتا رہتا ہے۔

اس روز وادی پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر ہر چیز گہرے دودھیا پردے میں چھپ گئی تھی۔ پریم نے ڈاک خانے جا کر چند خطوط کا جواب دیا اور باہر آگیا۔ وہ کمرے سے صرف اس لیے نکل آیا تھا کہ امر سنگھ اسے بلانے آیا تھا۔ اس روز امر سنگھ نے جانی واکر کا انتظام کیا تھا اور اپنے چند دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ ان کا پروگرام اس دن فلاش کھیلنے کا تھا۔ پریم کو فلاش سے کوئی رغبت نہیں تھی اور نہ ہی امر سنگھ کے ساتھ بیٹھ کر پینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دو پیگ پی کر ہی امر سنگھ بہکی بہکی باتیں شروع کر دے گا، لڑکیوں کے عجیب قصّے سنائے گا: وہ لڑکی جو ان کے لیے شراب اسمگل کرتی تھی؛ وہ لڑکی جو شراب پی کر تمام کپڑے اتار دیتی تھی اور جسے دیکھ کر سیاہ چٹان کا خیال آتا تھا۔ پریم کو ان باتوں سے سڑاند آنے لگی تھی۔ اسے احساس ہوتا اس کے گرد لاشوں کا ڈھیر لگا ہے۔ وہ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کھسک آیا تھا۔

ڈاک خانے کے چوک میں کھڑے ہو کر اس نے تمام راستوں پر نظر دوڑائی۔ وہاں دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایک دکان میں بلب روشن تھا اور دھند میں کسی بیمار کی آنکھ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ دکان دار گرد گرد لیے، گھٹنوں پر کمبل ڈالے، دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ پریم نے اس کا خاکہ لے لیا اور پھر خالی الذہن ہو گیا اور یونہی واٹر ورکس والی سڑک پر ہو لیا۔

وہ سڑک واٹر ورکس جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں داخلہ بغیر پرمٹ کے ممنوع تھا اس لیے لوگ اُدھر نہیں جاتے تھے۔ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے سڑک تقریباً کباڑیے کی دُکان کی شکل اختیار کر گئی تھی: پوڈر، بسکٹوں اور جیم کے خالی ڈبے، خالی ٹوٹی ہوئی شیشیاں، استعمال شدہ بلیڈ، صابن کے ریپر جو سڑک سے چپک گئے تھے، جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے کپڑے جو بارش اور ہوا کی وجہ سے اپنی اصلی شکل کھو چکے تھے اور محض چیتھڑے رہ گئے تھے اور کہیں کہیں بیڑیوں کے ادھ جلے ٹکڑے نظر آجاتے جو واٹر ورکس کے فورمین گارڈ کے عملے کے آدمی آتے جاتے پھینک جایا کرتے تھے۔

اچانک ایک موڑ پر اسے پرمندر دکھائی دے گئی۔ وہ سڑک کے کنارے ایک پتھر پر اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی اور ڈھلوان پر کھڑے گھنے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ دھند کی وجہ سے پریم ایک دم اسے نہیں پہچان سکا تھا، لیکن وہ ایک عورت کو اکیلے اس سنسان سڑک پر بیٹھے دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا۔ قریب پہنچنے پر جب وہ آہٹ پا کر چونکی تو وہ اسے پہچان گیا۔ شاید تنہائی میں ایک غیر مرد کو اس قدر قریب پا کر وہ گھبرا گئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔

"آپ تو ڈر گئی تھیں۔"

پرمندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قدموں میں پڑے ایک خالی ڈبے کو دیکھتی رہی۔ پریم ایک تانیے کو دیکھتا رہا۔ دھند میں لپٹی وہ دیو لوک کی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ دھند میں گلاب کی بھیگی پتیوں کی طرح ہل رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلو میں لٹکے تھے۔

"آپ تو یوں کھڑی ہیں جیسے باس کے سامنے پیش ہوں، بیٹھ جائیے۔"

"جی ـــــ جی ـــــ وہ ـــــ" اس نے پریم کی طرف دیکھا۔ پریم کو ان آنکھوں میں پھر وہی کچھ پگھلنے کا سا احساس ہوا۔ "آپ نے مجھے ادھر آتے دیکھا تھا؟"

"آپ اِدھر آنا کیا پاپ سمجھتی ہیں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ یونہی۔"

"بیٹھ جائیے، کھڑے کھڑے آپ تھک جائیں گی۔"

وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ پریم موسم کا ذکر کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ جلدی ہی اس کا خوف اور جھجک دُور ہو گئی۔ اب اس کی باتوں میں روانی آ چلی تھی۔ کبھی کبھی وہ مسکرا بھی دیتی۔ جب پریم نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ ایک دم شرما جاتی اور بات بھولنے لگتی۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" پریم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "آپ اس سُنسان سڑک پر اکیلی بیٹھی ہیں۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"کچھ سوچ رہی تھیں؟"

"نہیں۔"

چند منٹ کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ درختوں میں بینڈے بولنے لگے تھے اور دُھند پھر گہری ہونے لگی تھی۔ دُور نیچے کسی کوٹھی میں کوئی عورت اُونچی آواز میں کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ سڑک پر کسی کے بھاری قدموں سے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ پرمندر ایک دم خوف زدہ سی ہو کر سننے لگی۔

"کوئی آ رہا ہے۔"

"پھر کیا ہوا!"

"ڈلہوزی چھوٹی سی جگہ ہے، کوئی دیکھ لے گا تو ـــــ" ایک دم وہ خاموش ہو گئی، جیسے کوئی غلط بات کہہ گئی ہو۔

واٹر ورکس کا ایک چوکیدار انھیں سلام کرتا گزر گیا۔ پریم نے مسکرا کر پرمندر کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پرمندر نے جھجکتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں پڑے تھے۔ وہ کبھی انگلیاں پھیلا دیتی کبھی سکیڑ لیتی۔

"خواہ مخواہ نہیں ڈرنا چاہیے۔" پریم نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

وہ ویسے ہی انگلیاں پھیلاتی اور سکیڑتی رہی۔ پریم ایک لمحہ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر جھک کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ پرمندر کے جسم میں جھرجھری سی ہوئی۔ اس نے پگھلتی ہوئی نظروں سے پریم کی طرف دیکھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے، ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے بہت آہستہ سے ہاتھ پریم کے ہاتھوں سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن پریم نے اپنی گرفت قدرے مضبوط کر دی اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

"پرمندر" اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی۔"

"میری طرف دیکھو۔"

بڑی مشکل سے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ سکی۔ وہ جلدی میں گردن جھکا لیتی، لیکن پریم نے انگلی اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ اس کی پلکیں کپکپائیں اور پھر آنکھوں پر بھاری پردوں کی طرح گر گئیں۔ پریم نے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیے اور اس کے لبوں پر جھک گیا۔ وہ تڑپ کر اس کی بانہوں سے نکل گئی۔

"نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"اب چلنا چاہیے۔"

پریم اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا رنگ، سفید ہو رہا تھا اور وہ بار بار گھبراہٹ کے سے انداز میں ہاتھوں کی انگلیاں مل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اس نے سوچا: پہلی ملاقات ہے، کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنی چاہیے جس سے پرمندر اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرے یا گھٹیا تاثر لے۔

"چلو۔"

وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ اسے ان ناولوں کے بارے میں بتانے لگی جو اس نے پڑھے تھے۔ وہ اس طرح سنتا رہا جیسے پوری دلچسپی لے رہا ہو، حالانکہ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگلی ملاقات پرمندر کے ساتھ کیسے اور کہاں ہونی چاہیے اور تب اس کا کیا رول ہوگا۔ یہ وہ سمجھ چکا تھا کہ پرمندر کانچ کا برتن ہے جسے نہایت احتیاط سے چھونا ہوگا، غلطی ہونے پر برتن ٹوٹ سکتا ہے یا ہاتھ زخمی ہو سکتا ہے۔

اب وہ اس موڑ پر آ گئے تھے جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر سڑک ڈاک خانے کے چوک میں داخل ہوتی تھی۔ پرمندر ایک دم رک گئی۔ پریم اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ اسے دیکھتے ہوئے پریم کو احساس ہوا کہ وہ عجیب سی ہمسفر ہے، جیسے کشتی کے قریب جھیل میں چاند کا عکس ہو۔

"میں کل وہیں پتھر پر تمہارا انتظار کروں گا، اسی وقت۔"

"کل نہیں۔ میں روز اس طرح نہیں آسکتی۔ پھر کبھی سہی۔"

"کب؟" پریم نے بیتابی سے پوچھا، "پرسوں!"

"نہیں، میں خود بتا دوں گی۔"

"میں مر جاؤں گا۔ زیادہ دیر انتظار نہیں ہو سکے گا۔"

وہ مسکرا دی۔ "انتظار میں بڑا مزہ ہوتا ہے۔"

پریم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور ہاتھ چوم کر ڈھلوان پر اتر گیا۔ چند قدم اتر کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پرمندر تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پریم نے الوداع کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور گنگناتا ہوا نیچے اتر گیا۔

پریم اب امر سنگھ سے ملتا تو اسے عجیب سا احساس ہوتا۔ وہ چاہتا اس کے سامنے بیٹھ کر ہنستا رہے۔ بات کرتے کرتے وہ غور سے امر سنگھ کے چہرے کو دیکھنے لگتا۔ امر سنگھ حیران سا اس سے پوچھتا: "کیا بات ہے؟" وہ مسکرا کر "کچھ

نہیں" کہہ دیتا اور باتیں کرنے لگتا۔ امر سنگھ کی باتیں اب بھی ویسی ہی ہوتیں لیکن وہ برداشت کرتا رہتا۔ اس کی فضول اور بیہودہ باتیں سن کر وہ سوچتا: عورت کے لیے تو اس کے کتے سے بھی محبت کرنی پڑتی ہے۔ وہ آکر بیٹھتا تو پرمندر کو جیسے کچھ ہو جاتا۔ بار بار وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتی۔ وہ مسکراتا تو اس کے لیے مسکراہٹ چھپانی مشکل ہو جاتی۔ وہ اٹھ کر اندر چلی جاتی لیکن جلدی ہی لوٹ آتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے وہ کمرے میں پریم کے نزدیک رہنے کی کوشش کرتی۔ امر سنگھ اگر اٹھ کر اندر جاتا تو وہ ایک دوسرے کو خاموش سلام کر لیتے۔ پریم اشارے سے اسے اپنے قریب بلاتا، وہ بڑے ناز سے انکار کر دیتی اور اشارے سے سمجھاتی کہ ابھی امر سنگھ آجائے گا۔ پریم کو اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔ پرمندر بھی محظوظ ہوتی تھی۔ پریم اگر امر سنگھ کی غیر حاضری میں نیچے چلا جاتا تو وہ ایک دم گھبرا جاتی۔ تنہائی میں وہ پریم سے نظریں بھی نہ ملا سکتی اور باہر نکل آتی۔ پریم کمرے میں بیٹھا دو چار منٹ اس کا انتظار کرتا لیکن وہ ریلنگ پر جھکی نیچے ڈھلانوں کے مکانوں کو دیکھتی رہتی۔ پریم جھنجھلا کر لوٹ آتا۔ وہ سوچتا: اس ٹنٹے کو ختم کر دے گا۔ یہ بے معنی اور فضول کھیل زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ چند منٹ کی محتاط اشارے بازی کے بعد اسے بوریت کا احساس ہونے لگتا۔ پرمندر اسے قریب نہیں آنے دیتی تھی، لیکن جب وہ اسے باہر کسی سنسان مقام پر ملتی تو پریم سب کچھ بھول جاتا۔ وہ اس کے ہاتھ تھام لیتا اور پرمندر ان رومانٹک وادیوں کا ذکر کرنے لگتی جو پہاڑوں کے پیچھے، دنیا سے دور کہیں چھپی ہوئی تھیں اور جن میں خوبصورت پھول مہکتے تھے۔

پریم کو ایک شام وہ سیڑھیوں میں مل گئی۔

"چار بجے میں وہیں پتھر پر ملوں گی۔"

پریم خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اسے یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ پرمندر نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قدرے ٹھنڈی آواز میں بولی: "کیا بات ہے؟"

"میں سوچتا ہوں کیا فائدہ ہوگا۔ تمھارے پاس بیٹھ کر بھی مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ ہمارے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ تم مل کر بھی نہیں ملتیں۔"

"فائدہ!" پرمندر نے پژمردہ سے لہجے میں کہا، "میں تمھیں اوروں سے الگ سمجھتی تھی۔ تم —— تم ——"
اس کا گلا رندھنے لگا۔ وہ تیزی سے نیچے اتر گئی۔

اس شام پریم پانچ بجے تک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ مایوس ہو کر وہ لوٹ آیا۔ ہر موڑ پر وہ سوچتا کہ وہ سامنے سے آتی مل جائے گی۔ سڑک ختم ہو گئی، وہ ڈاک خانے کے چوک میں آگیا لیکن پرمندر دکھائی نہیں دی۔ اچانک پریم کو احساس ہوا کہ وہ چند ہے، اتنا عرصہ بے وقوف بنتا رہا ہے۔ پرمندر اسے اس دریچے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی جو اس کی زندگی کی کال کوٹھری میں کھل گیا ہے۔ اس نے تازہ سلگایا سگریٹ سڑک پر پھینک کر مسل دیا اور اس طرح Holiday Inn کی طرف چل دیا جیسے کوئی آخری فیصلہ کر لیا ہو۔ اندر کھڑکی کے ساتھ امر سنگھ اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ پریم ایک لمحے کو ٹھٹکا، پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا: اگر وہ بیٹھا تو پھٹ پڑے گا۔

چیئرنگ کراس پار کر کے وہ ارو ما میں جا بیٹھا۔ ہال خالی پڑا تھا۔ کافی کا آرڈر دے کر وہ پرمندر کے بارے میں سوچنے لگا: وہ آخر اس سے کیوں ملتی ہے؟ ان ملاقاتوں کا انجام کیا ہوگا؟ وہ ایک امیر آدمی کی بیوی ہے پھر اسے غیر مرد کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اچانک دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہال پر طائرانہ نظر ڈالی اور پریم کے سامنے والے صوفے پر آبیٹھی۔ پریم اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ وہی گوگلز والی عورت تھی جسے اس نے پہلے روز پٹھانکوٹ اسٹیشن پر

دیکھا تھا۔ صبح چھ بجے وہ پورے میک اپ میں گاڑی سے اس طرح نکلی تھی جیسے فرج سے فروٹ کریم برآمد ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈلہوزی تک ایک ہی بس میں سفر کیا تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو باقاعدہ طور پر لائسنس لے کر کوٹھے پر تو نہیں بیٹھتیں لیکن پیشہ کرتی ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو یہ محسوس کرانا چاہتی ہیں کہ وہ ایک باعزت عورت کے پاس آئے ہیں، کسی کسی کے ہاں نہیں۔

عورت نے اپنے لیے آملیٹ منگالیا تھا اور اب ٹماٹو ساس کے ساتھ کھا رہی تھی۔ پریم نے کافی پیتے ہوئے سوچا کہ عورت کا وجود زندگی کے آملیٹ کے لیے چٹنی کا کام دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، وہ بھی مسکرادی۔ کافی ختم کر کے وہ اس کی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ پریم نے بل ادا کیا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیے باہر نکل گئے۔

وہ دیر تک سڑکوں پر گھومتے رہے۔ تھوڑی دُور چل کر وہ رک جاتی اور مسکرا کر کہتی: "میں تھک گئی ہوں"

جب اس نے چوتھی مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تو وہ ایک موڑ پر کھڑے تھے۔ سڑک پر دُور تک کوئی آہٹ نہیں تھی۔ دور نیچے کھنڈلوگ کی مختصر سی آبادی میں چراغ جل چکے تھے، اور ان کے اوپر ایک درخت کا گھنا سایہ تھا۔ پریم نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ عورت ایک ایسا مکان ہے جس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوں۔ اس کے ہونٹوں کے خم میں بے پناہ جنسی کشش تھی۔ عورت کو بانہوں میں لے کر وہ اس کے لبوں پر جھک گیا۔ وہ مچل کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی اور ہنسنے لگی۔

"اوہ!" پریم نے جیسے کچھ سمجھتے ہوئے کہا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ نوٹ پرس میں ڈال کر وہ اس طرح اس کے قریب آگئی جیسے وزن کرنے والی مشین میں سکہ جاتے ہی کھٹ سے ٹکٹ باہر آجاتا ہے۔ پریم پھر اس کے لبوں پر جھکا، لیکن اسے اپنے اندر برف گرتی محسوس ہوئی، جیسے سب کچھ ٹھنڈا ہوگیا ہو۔ اس نے اس طرح اس کے لب چومے جیسے کوئی جھوٹی قسم کھانے والا عدالت میں کتابِ مقدس کو چھوتا ہے۔

وہ پھر ٹہلنے لگے۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گئی۔

"میں یہاں رہتی ہوں"

پریم نے کوٹھی کی طرف دیکھ کر سر کو ہلکی سی جنبش دی اور عورت کا ہاتھ دبا کر جدا ہو گیا۔ عورت نے اسے جاتے ہوئے دیکھا، کندھے اچکائے اور کوٹھی میں داخل ہو گئی۔

پریم اب جان بوجھ کر پرمندر سے بھی کترانے لگا۔ اگر وہ اس کے سامنے آجاتی تو پریم اس طرح پیش آتا جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں۔ پرمندر بڑی اُداس اور کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسے دیکھتی۔ پریم کو اس پر ترس آنے لگتا، لیکن وہ جی کڑا کیے رہتا۔ وہ نسبتاً زیادہ وقت نیچے امر سنگھ کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا، لیکن جب وہ تنہا ہوتا تو صرف پرمندر کے بارے میں سوچتا۔ اس کی روح اور اس کا جسم سلگتے رہتے اور وہ اکیلا سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ جب وہ خود سے بھی بور ہونے لگتا تو Holiday Inn میں جا بیٹھتا، اور جب ذہن گھومنے لگتا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آجاتا۔ وہ دیر سے گھر لوٹتا اور پڑ کے سو رہتا۔ صبح جب ذہن صاف ہوتا تو وہ اپنی آوارہ گردی اور 'دلِ دیوداسیت' پر ہنستا، لیکن شام ہوتے ہوتے اس پر پھر وہی اداسی اور فرار کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پرمندر کو دیکھ کر یہ کیفیت ایک دم شدید ہو جاتی۔

ایک شام وہ Holiday Inn میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ وہی عورت پھر دکھائی دی۔ اسے پرمندر کا خیال آیا۔ اس کے ذہن میں آگ سی سُلگ اٹھی اور وہ کچھ سوچے سمجھے بِنا عورت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مسکرائی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"
"کہیں نہیں۔"
"تو آؤ کہیں چلیں۔"

وہ ہنس دی اور وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پریم کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں اور کدھر جا رہا ہے۔ وہ صرف پرمندر سے بدلے رہا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ پرمندر مل جائے، وہ دیکھ لے کہ عورت تلاش کر لینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ دیر تک اسے لیے ٹہلتا رہا لیکن پرمندر نہیں ملی۔ اسے ایک دم غصہ آنے لگا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا، بہت کم لوگ باہر رہ گئے تھے۔

"تمہارے ہاں چلتے ہیں" پریم نے کہا۔

وہ محض ہنس دی۔ پریم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھا، کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر رُک کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ برآمدے میں بیٹھے نوکر نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اندر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ چند منٹ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک اس عورت نے ہنس کر پوچھا:

"وہ عورت تمہاری پرانی واقف ہے یا یہاں ملاقات ہوئی ہے؟"

پریم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک منٹ کو وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔

"کون؟"

"وہی سردار کی بیوی۔" اس کے چہرے پر معنی خیز ہنسی پھیل گئی۔

پریم نے دھوئیں کا مرغولہ چھت کی طرف اڑا کر کہا: "ہم ایک ہی کوٹھی میں رہتے ہیں، بس۔"

"میں نے اسے تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔"

پریم نے محسوس کیا کہ وہ بھڑک اُٹھے گا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا اور اس عورت کی طرف دیکھ کر قدرے سنجیدگی سے کہا:

"پھر میں تمہارے پاس کیا کرنے آتا؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ پریم چند سیکنڈ جیسے اپنے اندر اُٹھنے والے کسی طوفان سے لڑتا رہا، پھر اس نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ عورت نے پریم کی طرف دیکھا اور روپے اٹھا کر الماری میں رکھ آئی۔ لوٹ کر وہ پلنگ کے قریب رُک گئی۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم سی روشنی گلابی شیڈ میں سے چھن کر عورت کے سراپے پر پڑ رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور شیشوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ پریم نے سگریٹ سلگا لیا اور صوفے کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

وہ ایک منٹ خاموش کھڑی رہی، پھر ایک ایک کر کے اس طرح کپڑے اتارنے لگی جیسے سبزی چھیلی جاتی ہے۔ اب وہ پریم کے سامنے بالکل ننگی کھڑی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں اس کا جسم گوشت کا ایک بے ہنگم سا تودہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح اس کے جسم کا جائزہ لے رہا تھا جیسے جغرافیہ داں دُنیا کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ اس کا پیٹ ڈھلک آیا تھا،

چھاتیاں اپنی سختی نہ جانے کب کی کھو چکی تھیں اور اس کے جسم کے زاویے اور خطوط گوشت کی بھرپور فصل میں گم ہو گئے تھے۔
پریم اپنی جگہ پر جیسے برف ہو گیا تھا۔ اسے وہ جسم گانو کے اس کچے راستے کی مانند معلوم ہوا جس پر راہ گیروں کے قدموں کے نشان نظر آتے ہیں۔ وہ اس قافلے میں شامل ہونے آیا ہے؟ اس نے سوچا اور نظریں جھکا لیں۔

وہ کھڑی چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ وہ حیران تھی یہ کس قسم کا آدمی ہے۔

وہ سگریٹ بجھا کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو۔" وہ تقریباً چیخی اور تیزی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں یا چہرے پر عریانی کا کوئی احساس یا شرم نہیں تھی، ایک غصہ تھا۔

"اپنے روپے لیتے جاؤ۔" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "میں نے تم جیسے کئی امیر زادے دیکھے ہیں۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا سمجھ کر مجھ سے ملتے ہو؟ میں نے کوئی مندر نہیں کھول رکھا جہاں تم چند لمحوں کے لیے آتما کی شانتی کے لیے آ بیٹھو۔ میں پیشہ کرتی ہوں لیکن کسی حرام زادے کو میری بے عزتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ سمجھے! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

الماری سے چالیس روپے نکال لائی اور اس کے منہ پر دے مارے۔ پریم نے اس کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک ننگی کھڑی تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس رات وہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ آدھی رات کے بعد جب ایک سپاہی نے اسے پتھر پر بیٹھے دیکھ کر ٹوکا تو وہ اٹھا اور چپ چاپ کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

پرمندر کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ وہ شاید جاگ رہی تھی۔ پریم بھاری سے دل سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
وہ ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔

دوسرے دن وہ تمام وقت کمرے میں ہی رہا۔ اس پر عجیب سی بے حسی طاری رہی۔ امر سنگھ آ کر دیر تک بیٹھا رہا، اس نے شراب کا لالچ بھی دیا لیکن پریم کہیں جانے کو تیار نہیں ہوا۔ امر سنگھ کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا کہ آخر وہ ڈلہوزی میں کیا کر رہا ہے، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی سریندر کو لکھ دے گا کہ وہ جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد اس کے شانوں سے جیسے بوجھ اتر گیا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد اس نے ڈاک خانے جا کر سریندر کو خط لکھا۔ خط وہ پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ پرمندر آ گئی۔ وہ سیدھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ نصف پوسٹ کارڈ پوسٹ بکس میں تھا اور نصف باہر۔ پریم نے ٹھنڈی سی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھا۔ پرمندر کی آنکھوں میں التجا اور اداسی تھی۔ ایک لڑکا خط ڈالنے آیا، پریم نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں اس پتھر پر تمہارا انتظار کروں گی۔" پرمندر نے دھیرے سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

پریم مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ پرمندر چل کر ملاقات کے لیے کہے گی۔ ایک منٹ وہ کھڑا سوچتا رہا، پھر خط جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔ پرمندر اسی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ سگریٹوں کی ایک دکان پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک سگریٹ ختم کیا اور پرمندر کے پیچھے چلا گیا۔ اس سڑک پر قدم رکھتے ہی اسے فتح کا سا احساس ہوا اور اس کے دل سے غم کے بادل چھٹ گئے۔ وہ سیٹی پر ایک فلمی دھن بجانے لگا۔

پرمندر پتھر پر بیٹھی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ پریم کو دیکھ کر وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئی۔ اس کے لبوں میں حرکت ہوئی لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ پریم ایک منٹ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ کسمسائی، پھر جسم کو ڈھیلا

چھوڑ دیا۔ پریم نے اس کی ٹھوڑی انگلی سے اوپر کی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں سردیوں کی اس شام کا سماں تھا جب فضا پر دھواں چھایا ہوتا ہے۔ وہ ایک بت کی طرح کھڑی رہی۔ پریم نے محسوس کیا کہ اگر وہ دیر تک ان آنکھوں میں دیکھتا رہا تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس نے جلدی سے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹ پرمندر کے چہرے پر پھسلنے لگے اور آخر اس کے لبوں پر پیوست ہو گئے۔ پریم نے سوچا تھا: آج وہ چل کر آئی ہے، مکمل خود سپردگی کے عالم میں ہوگی اور اس سے لپٹ لپٹ جائے گی، لیکن وہ ویسے ہی بے جان سی کھڑی تھی۔ اس کے لب ٹھنڈے تھے، جیسے پتھر کے ہوں۔ اس کے ہاتھ لٹک رہے تھے۔ پریم الگ ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" پرمندر نے سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم ——— تم ———" پریم کچھ کہہ نہیں سکا، اس کے سفید چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ اسے ایک منٹ کو احساس ہوا کہ اس کے سامنے لاش کھڑی ہے۔ وہ ایک طرف ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"اب میں تمہارے پاس ہوں۔" پرمندر نے اس طرح کہا جیسے سڑک پر جاتا کوچوان آواز دیتا ہے: تانگہ خالی ہے۔

پریم نے حیرت سے پرمندر کی طرف دیکھا۔ اس کا تمام جوش سرد پڑ گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا: "بیٹھو"

وہ پتھر پر جا بیٹھی۔ پریم اس کے قریب زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔

"تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔" پریم نے ایک پتا مسلتے ہوئے کہا۔

"پھر تم اتنے دنوں سے مجھ سے بھاگتے کیوں پھر رہے ہو؟ روز رات کو دیر سے آتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جس کی سزا دے رہے ہو؟"

پریم نے محسوس کیا پرمندر کی آواز لرز رہی ہے۔ اس کا دل پرمندر کے لیے ایک دم پگھل گیا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولا: "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تم کیا جانو عورت جب پیار کرتی ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔" پرمندر کا گلا رُندھنے لگا تھا اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "میں سمجھتی تھی تم مجھے سہارا دو گے، لیکن تم مجھ سے ہر سہارا چھین لینا چاہتے ہو۔ تم مرد ہو، آج دل لگایا کل بھول گئے۔"

"نہیں پمّی، ایسا مت کہو۔" پریم کھسک کر اس کے بالکل ساتھ ہو گیا۔ وہ جذباتی سا ہو کر بار بار اس کے ہاتھ دبا رہا تھا۔ اس کا دل سینے میں پگھل کر بہا جا رہا تھا۔ اس ایک لمحے میں اس نے پورے خلوص سے سوچا تھا کہ وہ ہر قیمت دے کر اس عورت کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی کے جوہڑ میں کمل کی طرح مسکراتی رہے۔ "ایسا مت کہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، اب بھی کرتا ہوں اور سدا کرتا رہوں گا۔ میری آنکھوں میں جھانکو، میرے دل میں دیکھو، تمھیں اپنی ہی تصویر نظر آئے گی۔ میری ہر دھڑکن میں تمھارا نام ہوگا۔" اس نے سر پرمندر کی گود میں رکھ دیا۔

پرمندر آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ ان کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں میں بندرے بھی خاموش تھے۔ کبھی کبھی کوئی پہاڑی چڑیا کسی پیڑ میں چہچہانے لگتی۔

پریم نے خود ہی کہا: "تمھیں دیر ہو رہی ہوگی۔"

پرمندر نے اس طرح مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے بڑی بہن اپنے معصوم سے بھائی کی طرف دیکھتی ہے۔ واپسی پر پرمندر بہت خوش تھی۔ وہ اسے اپنے بچپن کے واقعات سنانے لگی جب اسے سیر و تفریح کا بہت شوق تھا اور اس کے پتا جی اسے لیے لیے پھرتے تھے۔ خاص کر اسے اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے اور یہ جاننے کا شوق تھا کہ ان پہاڑوں کے پیچھے کیا ہے۔ ایک رات وہ صرف اس لیے جاگتی رہی کہ پھول کو کھلتے دیکھ سکے، لیکن وہ دیکھ نہیں سکی۔ شاید وہ ایک آدھ منٹ کے لیے سو گئی تھی۔ اب بھی جب وہ صبح کسی کھلے پھول کو دیکھتی ہے تو خیالات کی وادیوں میں کھو جاتی ہے۔ ان خاموش کھڑے پہاڑوں کو دیکھ کر اب بھی وہی —— ان کے پیچھے جھانکنے کا —— جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ساری دنیا کا چکر لگائے، نئی نئی جگہیں دیکھے، بس گھومتی رہے، گھومتی رہے۔

پریم خاموشی سے سنتا رہا۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی اسکول کی بچی چل رہی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتا اور اس کا صحت مند متناسب جسم دیکھ کر جیسے حیران رہ جاتا۔

آخری موڑ پر پہنچ کر پریم نے اس کے ہاتھ چومے اور ڈھلوان پر اتر گیا۔ ڈاک خانے کے چوک میں اسے امر سنگھ مل گیا۔ وہ امر سنگھ سے اس طرح ملا جیسے مدتوں کے بعد مل رہا ہو، اسے خوب لپٹایا اور داڑھی بچا کر اس کی گال چوم لی۔

”کیا بات ہے؟ آج بڑے موڈ میں ہو۔“ امر سنگھ نے ہنس کر پوچھا۔

”آج ایک تصویر مکمل ہو گئی ہے۔“

”تصویر مکمل ہو گئی ہے؟“ امر سنگھ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پچھلے کئی دنوں سے تو تم نے برش کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

”کینوس پر نہیں، جانِ من! دل پر، آنکھوں میں۔ سمجھے!“

”کہاں تیر مارا؟“

پریم کے دل میں آیا امر سنگھ کے دل پر انگلی رکھ دے: ”یہاں۔“ لیکن وہ ہنس کر ٹال گیا۔ ”آؤ تمھیں پلاؤں۔“

”اس وقت! شام کو سہی۔“

شام کا پروگرام طے کر کے وہ کچھ دیر یونہی ٹہلتے رہے۔ گھر لوٹ کر وہ امر سنگھ کے ساتھ رمی کھیلتا رہا اور ہارتا رہا۔ پرمندر نے کئی مرتبہ اشاروں سے اسے منع کیا لیکن وہ اسے نظرانداز کرتا رہا۔ اس روز دوپہر کا کھانا بھی اس نے امر سنگھ کے ساتھ کھایا۔ سہ پہر کو وہ پھر باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر گھومنے کے بعد Holiday Inn میں جا بیٹھے۔

امر سنگھ نے 'کھجیار' کا پروگرام بنایا، پریم تیار ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچے پریم بے حد خوش تھا۔ وہ دن اسے اپنی زندگی کا بہترین دن محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کھوئی ہوئی جنت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ پرمندر چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ مکمل طور پر اس کی ہو جائے گی۔ وہ شریف عورت ہے، اس کی راہ میں شرم حائل ہے اور یہی اس رشتے کی جان ہے، ورنہ پرمندر میں اور اس گوگلز والی عورت میں کیا فرق ہوتا؟ آج اس نے ہونٹ چومنے کی اجازت دی ہے، کل... وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادلوں کے پیچھے بہتے چاند کو دیکھنے لگا۔ اسے نہ جانے کیوں ان بادلوں کے پیچھے پرمندر مسکراتی نظر آئی۔ اس رات وہ پرمندر کے ساتھ خواب میں اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتا رہا۔

دوسرے دن شام کو پرمندر اسے پھر ملی۔ وہ اوپر ہی آ رہی تھی کہ پریم اسے سیڑھیوں میں ہی مل گیا۔ پریم نے اس کے

ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"وہ کھجاد کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم جا رہی ہو؟"

"اگر تم جاؤ گے تو۔" وہ ہنسی۔

"اب تو مجھے چلنا ہی ہوگا۔"

"پرسوں پورنیما ہے، پرسوں صبح چلیں تو بڑے آرام سے شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ چاندنی رات ہوگی۔"

پریم اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اچانک شرما گئی اور نظریں جھکا لیں۔ پریم نے اسے اور بھی اپنے قریب کھینچ لیا اور اس کے لبوں پر جھک گیا۔

"وہ نیچے بیٹھے ہیں۔" کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ پریم اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ پرمندر کے جملے کا کیا مطلب ہے۔ وہ اسے ٹال گئی ہے یا تنہائی میں ملنے کا اشارہ دے گئی ہے۔ کھجاد چل کر دیکھا جائے گا، اس نے سوچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا

تیسرے دن وہ صبح جلدی ہی ناشتا کر کے نکل گئے۔ پرمندر نے کھانا تیار کر کے ساتھ لے لیا تھا، راستے میں انھوں نے کچھ سیب وغیرہ خرید لیے۔ پریم پیاسی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھتا۔ اسے امر سنگھ کا وجود اس روز بالکل فضول معلوم ہو رہا تھا۔ پرمندر اس سے نظر ملا کر مسکرا دیتی۔ کبھی کبھی وہ ان دونوں کو بھول جاتی اور راستے کے حُسن میں ڈوب جاتی، بڑے شاعرانہ انداز میں چیل کے جنگلوں اور ان پر طاری سکوت کی تعریف کرتی، راہ چلتی رُک جاتی اور انھیں اس کا انتظار کرنا پڑتا۔

لکڑ منڈی پہنچ کر انھوں نے کھانا کھایا، کچھ دیر سستائے اور چائے پی کر آگے بڑھ گئے۔ نہ جانے کتنی بار پریم کے دل میں پرمندر کا ہاتھ پکڑنے، اس کے لب چومنے، اسے باہوں میں لینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن امر سنگھ دیوار کی طرح ان کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ اُداس اور پیاسی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھ کر رہ جاتا۔ وہ امر سنگھ سے نظر بچا کر اس کی طرف دیکھتی اور وہ محسوس کرتا کہ اگلے لمحے وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔ اس کی نس نس تن کر ٹوٹنے پر آ جاتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ کھجاد پہنچ گئے۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دیودار کے اُونچے اُونچے درخت خاموش کھڑے تھے اور ان کے بیچ میں پلیٹ کی شکل کا ہرا میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت چند گھوڑے میدان میں گھاس چر رہے تھے۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔

پرمندر ایک درخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی پیمائش کا بورڈ پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بچوں کا سا جوش تھا۔

"ایک سو پچاس فٹ اُونچا، چودہ فٹ گھیرا۔" پرمندر نے جیسے خاموش فضاؤں سے کہا اور درخت کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگی۔ "یہ کتنا پُرانا ہوگا! نہ جانے کتنی آنکھوں نے اسے اتنے سے کو دیکھا ہوگا!" وہ اس طرح درخت کا ذکر کر رہی تھی جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا بچہ ہو۔ "نہ جانے کتنوں کو اس نے اس راہ سے گزرتے دیکھا ہوگا!"

پریم اسے محبت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوسرے درخت کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پھر تیسرے کے۔ امر سنگھ تھکا ہوا تھا، سستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بیزاری تھی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا: "یہ کیا پاگل پن ہے؟ اب چلو۔"

پرمندر ایک دم بجھ گئی۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ جیسے ایک دم سب کچھ بھول گئی۔ وہ جوش، وہ ولولہ، وہ اُمنگ۔ سب کچھ سرد ہو گیا۔ وہ زرخرید غلام کی طرح سر جھکا کر امر سنگھ کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پریم کو ساری وادی ایک دم ویران نظر آنے لگی۔ پرمندر کے جوش و ولولے نے ہر چیز میں جان سی ڈال دی تھی۔ درخت، پودے، میدان، راہ کے پتھر اور میدان کے ایک سرے پر بنی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی خوبصورت چوبی عمارت ——— ہر چیز جیسے پرمندر کے ساتھ مسکرانے لگی تھی، کھلکھلانے لگی تھی ——— اور اب سب کچھ ایک دم اداسی میں ڈوب گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر انھوں نے وہاں کے چوکیدار، دیوی سنگھ سے چائے لانے کے لیے کہا اور برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ امر سنگھ نے ایربیگ سے بوتل نکال کر میز پر رکھ دی اور مسکرا کر پریم کی طرف دیکھا۔ پرمندر نے بجھی بجھی سی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھا اور پھر دُور تک پھیلے ہوئے میدان کو دیکھنے لگی۔ فضا میں ایک سیٹی گونجی۔ اور گھوڑوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسری سیٹی پر وہ اونچائی کی طرف دوڑنے لگے اور چند سیکنڈ میں برآمدے کے سامنے دوڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے گم ہو گئے۔

چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ وادی پر مکمل سکوت طاری تھا۔ نیچے پانڈوؤں کے مندر کی زرد سی بتی جل رہی تھی اور وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے۔ دیوی سنگھ چائے لے آیا۔ چائے پی کر پریم اور امر سنگھ ٹہلنے کے لیے اُتر گئے۔ پرمندر نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پریم نے مجبور کیا بھی، لیکن امر سنگھ نے "اسے پتا نہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔" کہہ کر بات ختم کر دی۔

"پچھلی بارشوں کی وجہ سے میدان میں کیچڑ اور پھسلن ہو گئی تھی۔ امر سنگھ کچھ دُور جا کر لوٹ آیا۔ پریم جھیل تک گیا اور لکڑی کے پُل پر کھڑے ہو کر اس ننھے سے جزیرے کو دیکھتا رہا جو ہوا کے ساتھ پانی میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ جھیل میں کشتی پڑی ہوئی تھی۔ پہاڑوں سے مٹی بہہ آنے کی وجہ سے جھیل کا رقبہ کم ہوتا جا رہا تھا اور دلدل پھیلتی جا رہی تھی۔

پریم جب لوٹنے لگا تو راہ میں اسے ایک پہاڑی نوجوان مل گیا۔ نوجوان نے اسے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ہی پریم سمجھ گیا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ پریم نے سگریٹ سلگا کر اس کی طرف دیکھا۔

"صاحب، ڈلہوزی سے آئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کشتی کی سیر نہیں کی؟"

"مجھے تو اسے دیکھ کر ڈر آنے لگا تھا۔ بڑی شکستہ حالت میں ہے۔ اِدھر کوئی انچارج وغیرہ ہے؟"

"ہیں صاحب، سب ہیں، لیکن کوئی اِدھر دھیان نہیں دیتا۔ افسر لوگ آتے ہیں، لڑکیاں ساتھ لاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، رات رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جھیل میں دلدل بڑھ رہی ہے، کسی دن صرف دلدل رہ جائے گی۔" نوجوان نے حسرت سے شکستہ پُل کی طرف دیکھا، جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا تھا۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

"کشتی چلاتا ہوں صاحب۔"

"ہوں۔" پریم نے اس کی طرف دیکھا اور جیب سے ایک روپیا نکال کر اسے دے دیا۔ نوجوان نے نوٹ لے کر اسے پھر سلام کیا۔ پریم ریسٹ ہاؤس کی طرف چڑھنے لگا۔

امر سنگھ جیسے بیٹھا بیٹھا بور ہوگیا تھا۔
"وہاں کیا کر رہے تھے؟" اس نے بیزاری سے پوچھا۔ "آؤ"۔ اس نے بوتل اٹھا کر کہا، "ایسی خوبصورت شام ضائع کیے دے رہے ہو۔"
پریم نے پرمندر کی طرف دیکھا جو برآمدے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھی تھی اور ان دیوداروں کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے روشنی نظر آنے لگی تھی۔ چاند نکل رہا تھا۔
دیوی سنگھ گلاس اور پانی دے گیا۔ وہ پینے لگے۔ چاند ابھر تا رہا۔ امر سنگھ مدہوش ہو رہا تھا۔ وادی پر چاندنی کا غبار اُتر رہا تھا۔ ہر چیز، جو کچھ دیر پہلے اندھیرے میں گم تھی، ایک دم جیسے دودھ میں نہا کر جوان ہوگئی تھی۔ دور کہیں کوئی بانسری بجا رہا تھا۔
امر سنگھ کے قدموں میں لغزش آگئی تھی، آنکھیں پوری طرح نہیں کھل رہی تھیں، زبان میں لکنت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ پیے جا رہا تھا۔ پوری بوتل پی کر اسے اپنے حواس پر بالکل قابو نہیں رہا اور وہ اناپ شناپ بکنے لگا۔ پرمندر نے انھیں اُداس سی نظروں سے دیکھا۔ پریم کو جرم کا سا احساس ہوا، جیسے امر سنگھ کی اس حالت کا ذمہ دار وہ ہو۔ امر سنگھ نے کہا:
"اب سیر کریں گے۔ میں درخت پر چڑھ کر چاند کو پکڑ لوں گا، تم نیچے کھڑے رہنا ——— آؤ"۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑا گیا۔
پریم نے جلدی سے اسے سنبھالا۔ پرمندر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور امر سنگھ کو سہارا دے کر کمرے میں لے گئی۔ پریم وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب دروازہ اندر سے بند ہوگیا تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوی سنگھ نے آکر اسے کھانے کے لیے کہا۔ وہ اکیلا ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ کھانا کھا کر اس نے سگریٹ سلگایا اور برآمدے میں آگیا۔ بار بار اس کے جی میں آرہا تھا کہ وہاں سے اسی وقت چلا جائے، لیکن اس خیال سے کہ امر سنگھ کیا سوچے گا، وہ اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ الماری سے ایک کتاب نکال کر وہ اپنے کمرے میں آگیا۔
کافی دیر گزر جانے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے برآمدے میں کوئی چل رہا ہو۔ وہ کتاب رکھ کر اٹھا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ پرمندر سیڑھیوں کے قریب کھمبے کا سہارا لیے کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی۔ پریم نے اس کے سراپے کو دیکھا، چاروں طرف پھیلی رات کی خاموشی کو محسوس کیا اور اس کے خون کا دورہ تیز ہونے لگا۔ اس نے امر سنگھ کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ نیچے مندر کی بتی جل رہی تھی، چاند آسمان کے وسط میں آگیا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا پرمندر کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ پرمندر اپنے خیالات میں مگن چاند پر نظریں جمائے تھی۔ پریم نے آہستہ سے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پرمندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا: خوف سے اس کا چہرہ سفید ہوگیا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، لپ اسٹک بہت حد تک مدھم ہو چکی تھی اور ٹھوڑی اور گالوں پر پھیل گئی تھی، آنکھوں کے نیچے ہونٹوں کے کونوں تک کجرے کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں ——— جیسے وہ روتی رہی ہو۔
پریم نے اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے لیے۔ وہ بے جان سی کھڑی رہی۔
"پمی۔"
وہ خاموش رہی۔
پریم نے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیے اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ پرمندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہاں کھڑی ہو!"

"نیند نہیں آرہی تھی۔"

"میں بھی نہیں سوسکا۔" پریم اس کے لبوں پر جھک گیا۔

پرمندر نے سر پیچھے گرالیا۔

"مجھے یہ پسند نہیں۔"

"میری طرف دیکھو۔"

"میں کہہ چکی ہوں مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس بات سے گھن آتی ہے۔ مردوں کو عورت کے بدن کے سوا اور کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم آتما کے نہیں شریر کے پجاری ہوتے ہو۔"

"آتما بنا شریر کے کچھ نہیں۔ بھگوان نے مرد کے لیے عورت کا جسم بنایا ہے۔ اگر اسے آتما ہی تک محدود رکھنا ہوتا تو جسم کی کیا ضرورت تھی؟ روح تک پہنچنے کے لیے جسم کا رشتہ ضروری ہے۔"

"یہ پاپ ہے۔"

"کیا پاپ ہے؟ عورت اور مرد کا رشتہ؟"

"نہیں، جو ہم کر رہے ہیں، جو تم چاہتے ہو۔ میں شادی شدہ عورت ہوں، میرے لیے یہ پاپ ہے۔"

"پاپ پُن کچھ نہیں، یہ کمزور دلوں کی فضول سی دلیل ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہیں —— اور محبت میں کوئی پاپ پُن نہیں ہوتا۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"

"تم محبت کو نہیں سمجھتے۔ تم نے چاند اور چکور کو نہیں دیکھا؟ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں نہیں سُنیں؟"

"وہ محض کہانیاں ہیں اور بیمار ذہنوں کی پیداوار۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمھارے لیے جان دے سکتا ہوں، لیکن صرف تمھارے خیال سے محبت نہیں کرسکتا۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی حیثیت نہیں ہوسکتی۔ تمھاری محبت کے ساتھ میں تمھارا جسم بھی چاہتا ہوں۔ تمھارا سب کچھ میرا ہونا چاہیے —— صرف میرا ——"

"محبت لینے کو نہیں دینے کو کہتے ہیں۔ قربانی کے جذبے کا نام محبت ہے۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ تم سپنوں اور کتابوں کی دُنیا میں رہتی ہو۔ حقیقی زندگی میں آؤ۔" اس نے بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

پرمندر نے جھٹکے سے خود کو آزاد کرالیا۔

"مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں تمھیں دُنیا والوں سے الگ سمجھتی تھی، میں نے تم سے محبت کی تھی، لیکن تم نے میری محبت کا مذاق اُڑایا ہے، تم ——" اس کا گلا رُندھنے لگا۔

"تم نے کبھی مجھے نہیں چاہا، کسی کو پیار نہیں کیا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ کسی کو پیار کرسکو۔ تم صرف اپنے تصوّر سے عشق کرتی ہو۔ تمھارے ذہن میں ایک آئیڈیل ہے جس کی تم پوجا کرتی ہو۔ تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔ اس دُھند سے باہر آؤ، اس سپنوں کے جال کو توڑ دو۔"

وہ وہیں لکڑی کے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شال کندھوں سے پھسل کر فرش پر جا گری تھی اور وہ گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں بھر رہی تھی۔ پریم اسے کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس کے دل میں اس دکھی رُوح کے لیے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اس نے جھک کر اسے اُٹھانا چاہا۔

"چھوڑ دو، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولی، "تم سب بھیڑیے ہو، بھیڑیے۔"
وہ پھپھک کر رو دی۔ پریم نے آخری مرتبہ اس کی طرف دیکھا اور گردن لٹکا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

دِل دَریا

پاروتی۔

دل دریا اس کہانی کا آخری صفحہ ہے جو سنائی نہیں گئی۔

پاروتی اس صفحے پر جن دکھ بھرے تجربوں سے گزرتی دکھائی دیتی ہے، ان کے پیچھے تجربوں کا ایک پورا سلسلہ، پاروتی کا ماضی پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک خاموش، اداس، اندر ہی اندر جلتی سلگتی ہوئی عورت ہے، وہ دل کی جراحتوں کا منظر سامنے نہیں لاتی، کپڑے سی کر گزران کرتی ہے، بے سہارا اور اکیلی ہے، سو محلے کے لڑکوں کو سوئی دھاگے کے لیے بار بار بھیجتی رہتی ہے۔

لیکن وہ زخم جو اس کی روح سے وابستہ ہیں، انہیں رفو کرنے کا اسے یارا نہیں۔ بظاہر وہ کہانی کا سب سے خاموش، بے عمل کردار ہے لیکن سارے کردار اپنا اظہار اسی کے توسط سے کرتے ہیں۔ کہانی کا میں میں کی ماں اور اس کے پتا جی اس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں جس کا سرا پاروتی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس ڈور کو حرکت بھی نہیں دیتی لیکن کہانی کے بقیہ تمام کرداروں کا تفاعل ان کے اپنے اختیارات کے بجائے پوری کہانی پر محیط اس ساکت و صامت پرچھائیں کے سحر میں ہے جس کا مرکز پاروتی کی ذات ہے۔

وہ اپنے بال ہمیشہ کھلے رکھتی ہے کہ سنگار صرف سہاگنیں کرتی ہیں اور اس روز۔ جب میں تلوے میں کانچ کا ٹکڑا چبھ جانے پر رو دیا تھا' پاروتی نے بس اتنا کہا تھا: "مرد ہو کر اتنی سی چوٹ سے گھبراتا ہے، چل کھڑا ہو جا، کچھ نہیں ہوا، ایسی چوٹیں تو روز لگتی ہیں۔"

یہاں پھر، کہانی کی ڈور اس کہانی سے جا ملتی ہے جو شرون کمار ورما نے بیان نہیں کی لیکن جو موجودہ کہانی کی رگوں میں لہو کی صورت موجزن ہے۔

پتا جی کی اپنے آپ میں گم شدگی، ماں کی نفرت اور غصہ اور جلن، میں کی الجھن اور جستجو، ان سب کا مرکزی اور کلیدی نقطہ پاروتی ہے۔

وہ ماں کی نفرتوں اور وسوسوں کا ہدف اس لیے ہے کہ ایک ان دیکھی محبت اور دریا کی لہروں کی طرح مسلسل رواں، دواں، محوِ عدم کے سمندر کی جستجو میں سرگرداں اور اس طرح اپنے دائم و قائم دکھوں سے نجات کے لیے بے چین روح کا پیکر بھی اسی کا وجود ہے۔

وہ بیک وقت عاشق بھی ہے، محبوب بھی اور رقیب بھی۔ لیکن ایک ساتھ کئی دائروں میں گردش کرتی ہوئی یہ ساری کہانی جس کی بظاہر آنکھ سے اوجھل زمین پر شرون کمار ورما نے اس قصے کی دیواریں کھڑی کی ہیں، اس دل کی مانند ہے جو دریا ہے، تہہ میں زمانوں کے ان گنت سنگریزے اور موتی چھپائے، محبت کے ناموس کا پاس رکھنے کی خاطر جو چپ چاپ فنا کے ایک سفر سے گزرتا رہتا ہے کہ اب اپنے وجود کی پہچان کرانے کے لیے عدم کے سوا اس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

جبھی تو میں نے جب پاروتی کے کمرے میں رکھی لالٹین کی کالک جمی چمنی صاف کرنے کا ارادہ کیا تو وہ بے چین ہو گئی۔

"کل میں اسے اچھی طرح صاف کر دوں گا!"

"کیسے؟"

"لالٹین کی چمنی کو!"

اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ میں ڈر گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ لالٹین کی چمنی اگر صاف ہو جاتی تو پاروتی کی شخصیت کے اسرار کے ساتھ ساتھ ماں اور پتا جی کے رویوں کا بھرم بھی قائم نہ رہ پاتا۔

شمیم حنفی

میں کھڑا کھڑا تھک گیا ہوں۔

لوٹ کر دھرمشالہ جانے کو بھی من نہیں چاہ رہا۔ ایک عجیب سادکھ عجیب سی اُداسی سارے وجود پر چھاگئی ہے۔ ایسا گہرا اور لمحہ بہ لمحہ پھیلتا ہوا دُکھ جو کچھ کرنے نہیں دیتا، شاید یہی وہ دکھ تھا جس نے گوتم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دریا پر رات اُتر آئی ہے اور گھاٹ کی روشنیاں منہ منہ بہتے پانی پر جھلملا رہی ہیں۔ مندروں میں شام کی آرتی کے بعد خاموشی چھاگئی ہے۔ ایسی خاموشی جو مقدس بھی ہے اور پُراسرار بھی، بالکل خدا کے وجود کی طرح۔ دریا کے پار سادھوؤں کی ایک ٹولی الاؤ جلائے بیٹھی ہے۔ فضا میں کبیر کے دوہے کی سی نرم گمبھیر تا اور اداسی ہے اور میں گنگا کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ سادھو ہو جاؤں کہ یہی مکتی کی راہ ہے۔

میں بیٹھ گیا ہوں۔ ہر کی پوڑی ٹھنڈی ہے اور یہی بے جان سی ٹھنڈک فضا میں بھی ہے۔ بالکل ہمارے گھر کی طرح۔ گھاٹ سُنسان ہے۔ مجھے غور سے دیکھنے والا جٹادھاری سادھو کھڑاویں بجاتا پل پار کر چکا ہے اور وہ گھی کے چراغ جو میں نے پاروتی کی آتما کی راہ میں روشنی کرنے کے لیے ان پوتر لہروں پر بہائے تھے ڈولتے ہوئے دُور چلے گئے ہیں ——— اُدھر، جہاں سمندر ہے ——— وسیع و عمیق۔ اور وہ ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد بتی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے اور یوں چپ چاپ اُداسی سے سب کچھ دیکھ رہی ہے جیسے پاروتی اپنی کھڑکی کی سلاخیں تھامے کھڑی بچوں کو کھیلتے دیکھا کرتی تھی۔

پاروتی ہماری کوئی نہیں تھی۔ پڑوسن بھی نہیں۔ کبھی وہ ہمارے مکان کے ایک حصے میں کرایے دار تھی اور اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ پتا جی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ماں اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ (یہ سب باتیں مجھے گاہے بہ گاہے دیدی سے معلوم ہوتی رہی ہیں، جس نے یہ سب کچھ ماں اور دادی سے سُنا تھا۔) پاروتی کے ماں باپ نہیں رہے تھے اور اس کی پرورش اس کی بیوہ پھوپھی نے کی تھی۔ دادی نے ایک صبح ان کا سامان اٹھوا کر گلی میں رکھوا دیا کہ اُسے جگہ کی ضرورت تھی۔ پتا جی کی شادی جو تھی۔ ماں کو دادی اس کی پیدائش سے پہلے ہی پیار کرنے لگی تھی، یعنی جب وہ ہماری نانی کے پیٹ میں ہی تھی تو دادی نے اُسے اپنی بہو بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ دُنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گھر میں تھی۔ دادی پٹواری کی بیٹی اور تھانیدار کی بیوی تھی اس لیے ہمیشہ حکومت کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ اُس کے آگے چڑیا بھی پر نہیں مارتی تھی۔ (یہ کیسے ہو سکتا ہے؟) دادی میری پیدائش سے پہلے ہی آسمانوں میں چلی گئی جہاں جنت میں خدا اور جہنم میں شیطان کی حکومت ہے۔ نہ جانے وہ وہاں کیا کرتی ہوگی۔ شاید چڑیوں کو اُڑتے دیکھتی ہو۔

پاروتی اور اس کی پھوپھی ہمارے مکان سے نکل کر اس مکان میں رہنے لگیں جس میں آخر تک پاروتی رہی۔ اس کی پھوپھی غریب تھی اور بوڑھی بھی۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ پاروتی کی شادی ہو جائے، لیکن پاروتی ہمیشہ انکار کرتی رہی اور جب پھوپھی بھی مر گئی تو یہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہا۔

پاروتی میری کوئی نہیں تھی پھر بھی اپنی، بہت زیادہ اپنی لگتی۔ ایسی جو دل میں، روح میں اپنی ہوتی ہے اور سوچوں میں بستی ہے اور ہم ہر جگہ، ہر لمحہ اُسے اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ کھڑکی اس کھولے میں کھلتی تھی جہاں گلی کے بچے کنچے کھیلا کرتے تھے اور شور مچاتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے پھر فوراً من جاتے تھے۔ اسکول کی طویل قید اور گھر کی پابندیوں کے بعد یہ اچھا لگتا تھا۔ میں بھی اسکول سے آکر سیدھا وہیں جاتا۔ نہ جانے کیوں پاروتی کے مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونا جی کو بھاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دیوار کے پیچھے اس مشین کی آواز ہوتی تھی جس پر پاروتی محلے والوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب وہ کھڑکی میں آتی تو ہم سمجھ جاتے کہ اُسے سوئی، بٹن یا دھاگے کی گولی کی ضرورت ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے ڈر لگتا کہ کہیں وہ مجھ سے نہ کہہ دے۔ کیا میں انکار کر سکوں گا کہ میں چاہتا بھی تو تھا کہ وہ اپنے سب کام مجھ سے کروائے۔ اس کی شخصیت میں اس قدر کشش تھی، اس کی آواز اتنی میٹھی، اتنی پیاری تھی۔ اور کیا میری ٹانگیں مجھے گلی کے باہر اس دکان تک لے جائیں گی جہاں یہ سب کچھ ملتا تھا، کہ ماں کی سخت ہدایت تھی کہ اس سے بات نہ کرو۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتی تھی۔ اس کی نظریں ایک پل کے لیے میرے چہرے پر ٹھہرتیں، وہ مسکراتی، جیسے میرے خیالات پڑھ رہی ہو۔ بڑے ہونے کے کتنے فائدے ہیں! وہ کسی اور کو بلا کر چیز منگا لیتی۔ میرا دل اُس کوئلے کی طرح بجھ جاتا جس پر پانی ڈال دیا گیا ہو اور پھر میں سارے کنچے ہار جاتا کہ ہارنا ہی اچھا لگتا۔

"پاروتی مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔" میں دیدی کو بتاتا۔

"شی! ماں سُن لے گی۔"

"ماں ہمیں اس سے بات کرنے سے کیوں منع کرتی ہے؟"

"وہ ہماری دشمن ہے۔"

ماں کہتی تھی پاروتی اچھی عورت نہیں ورنہ کوئی اس سے شادی نہ کر لیتا، اور یہ کہ وہ جادو ٹونا کرتی ہے۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ جادو کرنے والیاں آدمی کو بھیڑ یا کتا بنا کر قید کر لیتی ہیں اور وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ میں کنچے کھیلتا ہوا اسے غور سے دیکھتا تو وہ مجھے جادوگرنی بالکل نہ لگتی۔ اس کا چہرہ گول اور خوبصورت تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور کالی۔ وہ بال ہمیشہ کھلے رکھتی تھی جس سے کبھی کبھی مجھے ڈر سا آنے لگتا۔ میں جب اسے دیکھتا تو مجھے ماں کے پوجا کے کمرے میں رکھی چاندی کی لکشمی یاد آنے لگتی۔ اور لکشمی کی تو ماں پوجا کرتی تھی، پھول چڑھاتی تھی اور آرتی اُتارتی تھی لیکن پاروتی کو گالیاں دیتی تھی اور کوستی تھی۔ میں پتاجی سے پوچھتا تو وہ یوں میری طرف دیکھتے جیسے میرے آر پار دیکھ رہے ہوں۔ مجھے ان کا اس طرح دیکھنا ہمیشہ عجیب سا لگا ہے اور اس سے خوف بھی آیا ہے کہ ہم خود کو ان نظروں کے سامنے محفوظ محسوس نہیں کرتے اور کوئی راز، راز نہیں رہتا، اور جب ہمارا راز، راز نہ رہ سکے تو زندگی کیا ہوئی، ہمارے وجود کے معنی کیا ہوئے؟ شخصیت میں تھوڑا سا اسرار ضرور ہونا چاہیے کہ اس طرح آدمی Important بنا رہتا ہے۔ وہ مجھے جب اس طرح دیکھتے تو میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگتا اور مجھے خود پر غصہ آنے لگتا کہ میں انھیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں صرف اُن کا چہرہ، ناک کان، ہاتھ پانو دیکھ سکتا تھا کہ ماں نے بہت بچپن میں بتایا تھا کہ یہی تمھارا باپ ہے۔ (سب مائیں شاید یہی بتاتی ہیں، معصوم بچوں کو دھوکا دیتی ہیں) لیکن

دراصل وہ باپ نہیں ہوتا جسے ہم دیکھتے ہیں۔ باپ تو اُس کے اندر، بہت گہرائی میں کہیں چھپا ہوتا ہے جسے ہم میں سے بہت کبھی نہیں دیکھ پاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہی سچائی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

"پاروتی جادوگرنی ہے؟" میں پوچھتا۔

"جادو کوئی چیز نہیں۔"

"تو پھر ماں کیوں کہتی ہے؟"

"آدمی کو وہی بات ماننی چاہیے جس کا اسے یقین ہو۔"

"اسے بھی کسی کام کا نہ چھوڑنا۔" ماں، ایسے موقعوں پر، نہ جانے کہاں سے آ ٹپکتی۔ جب پتاجی کی باتیں اچھی لگنے لگتیں اور دل ان کے پاس بیٹھنا چاہتا تو وہ چلی آتی۔

"چل، پڑھ جاکر۔"

پتاجی خاموش ہو جاتے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا کہ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں۔ میں اُٹھ کر آجاتا۔ ماں بعد میں بھی بولتی رہتی لیکن پتاجی کی آواز سُنائی نہ دیتی۔ وہ ماں کی باتوں میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔ جو وہ کہتی خاموشی سے مان لیتے اور گھر میں بے تعلق سے رہتے۔ تب بھی ماں اُن سے ناراض رہتی۔ پتاجی سے بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں لوہے کی گولیوں کی طرح سرد رہتیں، پیشانی پر بل ہوتے اور لہجے میں تلخی ہوتی۔ اس کی آواز دیر تک سُنائی دیتی رہتی: کچن میں، آنگن میں، کمرے میں اور ہم سب بہن بھائی سہمے سے کونوں میں دبکے رہتے اور پتاجی کے حقے کی گڑگڑ اور بھی تیز ہو جاتی اور دھواں جلدی جلدی اُن کے مُنہ سے نکلنے لگتا اور وہ سر جھکائے اپنی مخصوص آرام کرسی پر خاموش بیٹھے رہتے۔ میں سوچتا وہ گوگی یا ڈالی کے ڈیڈی کی طرح کڑکتے گرجتے کیوں نہیں، کبھی کبھی ماں کو ڈانٹ کیوں نہیں دیا کرتے؟

میں ماں کی اُن لوہے کی گولیوں جیسی سرد نظروں سے بچنے کے لیے پُوجا کے کمرے میں چلا جاتا جہاں چاندی کی کلشی پھولوں میں ڈھکی ہوتی اور کمرے میں صندل اور لوبان کی خوشبو ہوتی۔ ماں دیر دیر تک مورتی کے آگے جھکی رہتی۔ پتاجی اس کمرے میں کبھی نہیں گئے تھے حالانکہ وہ ہمیشہ دھرم اور آتما اور پرماتما کی باتیں کرتے۔ ان کی باتیں دلچسپ تو لگتی تھیں لیکن تب سمجھ نہیں آیا کرتی تھیں۔ مورتی کے سامنے کھڑا میں سوچا کرتا ماں جب دھرم کرم کو مانتی ہے، پوجا پاٹھ کرتی ہے تو پتاجی سے لڑتی کیوں ہے اور وہ اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہے اور ہمیں پیار کیوں نہیں کرتی، کبھی ہمارا مُنہ کیوں نہیں چومتی، چھاتی سے کیوں نہیں لگاتی، دودھ بھی پینے کو دیتی ہے تو ڈانٹ کر، کھانا کھلاتی ہے تو گھور کر۔ ڈالی کی ماں کتنے پیار، کتنی نرمی اور محبت سے بات کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں ربن ڈالتی ہے اور اسے دروازے تک چھوڑنے آتی ہے اور مسکرا کر "ٹاٹا" کہتی ہے۔ ماں نے کبھی ہمارا ہاتھ مُنہ نہیں دُھلایا۔ مجھے یاد ہے وہ کبھی ہمیں رات کو دیکھنے نہیں آئی، ہم پر رضائیاں نہیں ڈالیں اور ہمیں کہانیاں نہیں سنائیں۔ وہ لوری گا سکتی ہے کہ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ وہ جھڑک سکتی ہے، گالیاں دے سکتی ہے: "مرو جاکر، میری جان کیوں کھا رہے ہو، اپنے باپ سے کہو جاکر۔" یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے باوجود وہ ہماری ماں ہے کہ اس نے ہمیں جنم دیا ہے۔

اس شام بھی، جب وہ پتاجی کے کمرے سے بڑبڑاتی نکلی تھی اور اس کی پیشانی پر بل تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، میں چپکے سے پوجا کے کمرے میں چلا گیا تھا اور وہاں ایک کونے میں دبکا اس چوہیا کو دیکھ رہا تھا جو چوکی کے پیچھے سے نکلتی، دو گول گول سی آنکھوں سے خوفزدہ سی اِدھر اُدھر دیکھتی اور بتاشوں پر جھپٹتی اور تھوڑا سا کتر کر بھاگ جاتی۔ چیونٹیوں کی ایک قطار بتاشوں سے دیوار تک چل رہی تھی۔ کبھی کبھی دو چیونٹیاں ایک دوسری کے سامنے آجاتیں تو ایک تانیے کے لیے رُکتیں، شاید آپس میں باتیں کرتی

ہوں : ہیلو، کیا حال ہے، کدھر چلیں؟ اور پھر اپنی اپنی راہ پر بڑھ جاتیں۔ مجھے اس کونے میں بڑا سکون ملتا۔ گھر کی بجھی بجھی، سرد، بوجھل اور موت سی خاموش اور زرد فضا سے وہ کونا کہیں اچھا تھا۔ میں دیوار سے لگا بیٹھا چوہیا اور چیونٹیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ماں آگئی۔ آتے ہی اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب وہ پلٹی تو مجھے دیکھ سکی۔ لپک کر اس نے مجھے بازو سے اٹھا لیا اور گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔

"بتاشے چرانے گیا تھا؟"

بہت پہلے کبھی میں نے یہ حرکت کی تھی اور ماں سے چانٹا کھا کر اور یہ سن کر کہ 'یہ پاپ' ہے پھر کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن ماں ——— وہ ہمیشہ یہی شک کرتی ہے۔ اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں اور وہ بات کہنے سے پیشتر کبھی نہیں سوچتی اور پھر کبھی پشیمان بھی نہیں ہوتی۔ چوری کا الزام لگا کر وہ مجھے گھور رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ جواب دینا فضول ہے، وہ اعتبار تو کرے گی نہیں۔ میں خاموش رہا۔

"تم سب نرک میں جاؤ گے۔ سب کے سب پاپی ہو۔"

اس پل پتا جی چھڑی سنبھالے کمرے سے نکلے تھے۔ وہ ماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے رکے۔

"جاؤ سیر کا حرج ہو گا۔" ماں کے لہجے میں زہر تھا۔ "کبھی سوچا ہے کہ کوئی گھر بھی ہے۔ بچے چوری کرنا سیکھ رہے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں چرایا۔" میں نے پتا جی سے کہا۔

"فیصلہ دینے والا بھگوان ہے، ہم نہیں، کہ وہ جانی جان ہے۔"

"اونہہ۔" ماں نے ہونٹ پچکا کر نفرت اور غصّے کا اظہار کیا۔ "دیکھ لینا، وہ دُردشا ہو گی سب کی کہ یاد کرو گے۔ سات جنم دُکھ بھوگو گے۔" اور پھر مجھ سے : "جا مر، پڑھ جا کر۔ کیوں سب میری جان کے دشمن ہو رہے ہو!"

اس لمحے میں نے ماں کے لیے سخت نفرت محسوس کی۔ کچھ دیر ماں بڑبڑاتی رہی پھر گھر پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں کتاب لے کر دیدی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ٹننگ کر رہی تھی۔ میرا جی پڑھائی میں نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا جی کہاں گئے ہوں گے۔ ان کا کوئی دوست نہیں تھا، فلم کا شوق انھیں نہیں تھا، کوئی ہابی تھی نہیں پھر وہ آخر کرتے کیا ہیں۔ رات کو دیر سے لوٹتے ہیں۔ تب ماں جا کر دروازہ کھولتی ہے اور وہی سالوں پرانا جملہ سنائی دیتا ہے : "ہو گئی سیر ختم۔" اور وہ پتا جی کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتی ہے۔ اس وقت سب سو گئے ہوتے ہیں۔ میں جاگتا رہتا ہوں۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا ہے کہ جا کر دروازہ کھولوں لیکن ہمت نہیں ہوتی۔

اس شام بھی کنچے جیبوں میں بھر اس کھولے میں گیا تھا۔ کنچوں سے زیادہ مجھے پاروتی میں دلچسپی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ماں ہر وقت اسے بُرا کیوں کہتی رہتی ہے اور وہ کیسے جادو کرتی ہے۔ کھیلتے کھیلتے میرے پانو میں کانچ کا ٹکڑا چبھ گیا اور خون بہنے لگا۔ میں ماں کے ڈر سے رو بھی نہ سکا کہ وہ ایسے موقعوں پر ہاتھ، سے بات کرتی تھی۔ تمام بچے میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ شاید کسی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ خون کو کیسے روکا جائے۔ اسی وقت کھڑکی میں پاروتی دکھائی دی۔

"کیا ہوا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"پپو کو چوٹ لگی ہے، بہت خون نکلا ہے۔"

چند سیکنڈ بعد وہ میرا پانو پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر اپنے مکان میں لے گئی۔ اس نے روئی

اسپرٹ میں تر کر کے میرا زخم صاف کیا۔ اسپرٹ نے زخم میں مرچیں سی لگا دیں تو وہ جھک کر پھونک مارنے لگی۔
"مرد ہو کر اتنی سی چوٹ سے گھبراتا ہے۔" وہ ہنسی۔ "چل کھڑا ہو جا، کچھ نہیں ہوا، ایسی چوٹیں تو روز لگتی ہیں۔"
یہ لہجہ، یہ ہمدردی، یہ اپنا پن میرے لیے بالکل نیا تھا۔ ماں ہوتی تو چانٹا مار کر پوچھتی: "آنکھیں بند تھیں؟ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیا کرو۔" اور پھر وہ دیدی سے کہتی: "اری پٹی باندھ دے اس کے۔" میں حیرت اور شوق سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اب وہ جادو کرے گی اور میں میمنا بن جاؤں گا۔ دل کی گہرائیوں میں کہیں خوف رینگ رہا تھا: اس سانپ کی طرح جو نہ ہوتے ہوئے بھی اندھیرے میں محسوس ہوتا رہتا ہے۔
"کیا دیکھ رہا ہے رے؟" وہ مسکرائی۔
"تم جادو سے مجھے بٹیر بنا دو گی؟" میں نے ایک دم کہہ دیا۔
وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اچھا! کس نے کہا تجھ سے؟"
میں چپ رہا اور ایک دم مجھے ماں سے نفرت کا احساس ہوا اور نہ جانے کیوں میں نے سوچا کہ ماں سے بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے دبے لہجے میں کہا:
"ماں کہتی ہے۔"
پاروتی ایک دم سنجیدہ ہو گئی پھر ہنسنے لگی۔ میرا خیال تھا وہ ماں سے نفرت کا اظہار کرے گی، اسے گالیاں دے گی اور اس طرح میرے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو سکے گی، لیکن میرے اس جذبے پر اس نے ہنس کر اوس ڈال دی۔ میں نے پوچھا:
"جادو کیسے کرتے ہیں؟"
"جادو کوئی چیز نہیں۔" وہ زخم پر پٹی باندھتے ہوئے بولی۔ "آدمی کو جادو سے نہیں محبت اور پیار سے جیتا جاتا ہے، اور جو محبت کر سکتے ہیں بھگوان ان سے خوش ہوتا ہے۔"
"پتاجی بھی یہی کہتے ہیں۔"
پاروتی نے میری طرف دیکھا اور اسپرٹ کی شیشی اٹھا کر الماری میں رکھنے چلی گئی۔ اس وقت باہر ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ شاید کسی نے ماں کو خبر کر دی تھی۔ میں سہم گیا۔ پاروتی میرے قریب آئی، میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار سے بولی:
"تمھاری ماتاجی ہیں؟"
میں نے خوف زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پل تو میں نے سوچا کہ پاروتی مجھے جادو سے بٹیر بنا ہی دے اور ماں دیکھ کر چلی جائے۔
"جو ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔" وہ بولی۔ "آؤ۔" اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔
ماں نے مجھے گھور کر دیکھا اور یوں میرا ہاتھ جھپٹ لیا جیسے میں اڑا جا رہا تھا۔
"اسے کانچ چبھ گیا ہے، میں نے زخم دھو دیا ہے، گھر جا کر ٹنکچر لگا دیجیے گا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"
"پتا ہے۔" ماں نے تلخی سے کہا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئی۔ اوپر پہنچ کر اس نے مجھے پتاجی کے سامنے کھڑا کر دیا

اور غصے سے بولی:

"دیکھیے اپنے لاڈلے کے کرتوت۔ پوچھو اس سے کہاں گیا تھا۔"

پتاجی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"میری تو اس گھر میں کوئی سنتا ہی نہیں، جو میں کہتی ہوں وہی نہیں ہوتا۔" پھر وہ مجھے جھنجھوڑ کر بولی: "بول کہاں گیا تھا؟"

"کھیلنے۔"

"کھیلنے کے بچے، میں پوچھتی ہوں تو اس کلموہی کے گھر کیا کرنے گیا تھا۔"

"وہ آپی لے گئی تھی۔" میں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

"دیکھ لیا۔" ماں نے پتاجی کی طرف دیکھا۔ "میں کہے دیتی ہوں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ لے گئی تھی رانڈ مرہم پٹی کرنے۔ ماں سے سگی پھپھے کٹنی۔ کنجری کوئی جادو ٹونا کرے گی میرے بچے پر۔ اپنا کوئی آگے پیچھے ہے نہیں، دوسروں کے دیکھ نہیں سکتی۔ میری تو چھنال جنم جنم کی بیرن ہے۔ نہ جانے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ ہے بھگوان مرتی بھی نہیں، ہٹی کٹی پھر رہی ہے، اسے آئے کسی کی آئی۔"

پتاجی سر لٹکائے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کا ہاتھ کرسی کے بازو پر رکھا کپکپا رہا تھا، ٹانگیں لرز رہی تھیں اور نچلا ہونٹ انھوں نے زور سے دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ ماں کا غصہ ایک دم اور بھی تیز ہو گیا۔ اس نے زور سے میری پیٹھ پر دو ہتڑ جمایا اور لات مار کر بولی:

"اب وہاں گیا تو لاتیں توڑ دوں گی۔ سمجھا!" اور وہ مجھے گھسیٹتی باہر لے گئی۔ "آج تجھے کھانا نہیں ملے گا۔"

اس رات بھی پتاجی دیر سے لوٹے۔ جب ماں تھک کر اپنے بستر پر پڑ رہی تو وہ میرے پاس آئے۔ بھوک کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتاجی ایک منٹ کھڑے اندھیرے میں مجھے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے میرے سرہانے ایک پیکٹ رکھ دیا اور چلے گئے۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر پیکٹ کھولا۔ اس میں سینڈوچز، پیسٹریاں اور بن تھا۔ میں ایک منٹ تک ہاتھ سے وہ چیزیں محسوس کرتا لیٹا رہا، پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں پتاجی سے بیحد محبت کرتا ہوں، میں اس شخص کے اندر دیکھ رہا ہوں جو میرے سامنے بھی نہیں۔ میں اندھیرے میں لیٹا لیٹا کھاتا رہا۔ پھر میں سو گیا۔

صبح اس پیکٹ کی وجہ سے ماں اور پتاجی میں لڑائی ہوئی۔ پتاجی نے صرف اتنا کہا کہ وہ بچوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے۔ ماں اور بھی بھڑک اٹھی اور جو جی میں آیا کہے گئی۔ پتاجی حسبِ معمول خاموش رہے۔

"تم چاہتے ہو میری گھر میں کوئی عزت نہ رہے، میرے بچوں کو میرے خلاف اکساتے ہو، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ جو میں کہتی ہوں تم اس کے خلاف ہو جاتے ہو۔ چلی جاؤں گھر چھوڑ کے؟ پر یاد رکھو اتنی آسانی سے میں بھی نہیں جانے والی۔"

اور پھر وہی رونا دھونا اور ٹھنڈا چولھا اور موت کی سی سرد اور زرد فضا۔ اس روز پتاجی مجھے اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ساتھ کسی بچے کو لیا تھا، ورنہ ہم میں سے کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ باپ کی انگلی پکڑ کر بازاروں میں سے گزرنا اور کھلونوں اور مٹھائیوں کے لیے ضد کرنا کیا ہوتا ہے۔ پتاجی کی انگلی تھامے بازاروں میں سے گزرنا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا بڑا اچھا لگا کہ اس میں ایک طرح کی حفاظت اور بڑے پن کا احساس تھا اور ان تمام چیزوں اور مناظر کے معنی بدل گئے تھے جو میں نے اسکول سے آتے جاتے اکیلے دیکھے تھے۔ اب ان میں وہ اجنبیت اور روکھاپن اور کھردراپن

نہیں رہا تھا جو دل کو اذیت پہنچاتا تھا اور قریب کی چیزوں کو بھی بہت دور کرتا تھا اور بھرے شہر میں اکیلا چھوڑ جاتا تھا۔ ہم مندر میں جا بیٹھے ۔ میں تالاب میں مچھلیوں کو دیکھ رہا تھا اور پتا جی کی آنکھیں مندر کے کلس پر چمچماتی دھوپ پر تھیں ۔ میرا جی مچھلیوں کے ساتھ تیرنے اور پانی میں غوطہ لگانے کو کر رہا تھا ۔ لوگ مندر میں آ جا رہے تھے ۔ ان کے ہاتھوں میں پھول اور پرشاد تھا ۔

" تم پاروتی کے ہاں کیوں گئے تھے ؟ " اچانک انھوں نے پوچھا ۔ ایک مچھلی سطح پر تیرتے پھول کو سونگھ کر پانی میں غوطہ لگا گئی تھی ۔

" پتا جی پاروتی بری عورت ہے ؟ "

" وہ دیکھو پھول ۔ کوئی تم سے پوچھے تو تم فوراً کہہ سکتے ہو کہ یہ پھول ہے ۔ لیکن یہ تو تم نہیں بتا سکتے کہ پانی کے اندر تالاب کی تہہ میں کیا ہے اور سمندر کی تہہ میں کیا ہے ۔ یہ تو تم بالکل نہیں بتا سکو گے کیوں کہ تم نے وہاں پہنچ کر دیکھا نہیں ۔ اور جو سن کر سیکھتے ہیں وہ پوری طرح نہیں سیکھتے اور جو خود تلاش کرتے ہیں اور ڈوب کر پتا کرتے ہیں وہ پوری طرح سیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں ۔ "

مجھے اس وقت پتا جی کی بات سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن اچھی لگی تھی ۔ ان کی بھاری ، گمبھیر آواز دل تک پہنچ رہی تھی اور اس دھوپ کی طرح اچھی لگ رہی تھی جو سردیوں میں سرسوں کے کھیتوں پر چمکتی ہے اور بدن کو میٹھی میٹھی گرمی دیتی ہے ۔ پتا جی وہاں مندر میں بیٹھے اس شیشے کی طرح لگ رہے تھے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے اور اس شخص سے بالکل مختلف تھے جو آرام کرسی میں نیم دراز حقہ پیتا تھا اور کوئی تعلق کسی سے نہیں رکھتا تھا ۔ پتا جی نے کہا کہ میں مندر میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں ۔ میں اندر ، جہاں مورتیاں تھیں ، چلا گیا ۔ بڑی بڑی ، سونے چاندی اور پھولوں سے ڈھکی مورتیوں اور چاندی کی چھت والے کمرے اور سونے کی طرح چمکتے ستونوں کو دیکھ کر بڑا اچھا لگا اور میں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موندلیں اور پرارتھنا کی کہ ماں پتا جی سے لڑنا اور پاروتی کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے ۔ (جو منظور نہیں ہوئی ۔) دعا مانگ کر میں باہر آ گیا ۔ پتا جی تالاب میں مچھلیوں کو آٹا ڈال رہے تھے جو بڑی تعداد میں سطح پر آ گئی تھیں ۔

" چلیں ؟ " انھوں نے پوچھا ۔

ہم مندر کی حدود سے نکل آئے ۔ کچھ بچوں کو کھلونے اور مٹھائی لیتے دیکھ کر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کچھ لینا پسند کروں گا ۔ میں نے انکار کر دیا ۔ پھر میں نے انھیں اپنی پرارتھنا کے بارے میں بتایا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے :

" ہاں ، ماں کے لیے دعا کیا کرو ۔ "

" پتا جی ، ماں آپ سے لڑتی کیوں ہے ؟ "

" اُس کا اس میں کوئی قصور نہیں ۔ "

" پھر کس کا قصور ہے ؟ "

" شاید اس میں کسی کا بھی نہیں ۔ "

" پتا جی ، میری کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کو بُرا مت کہو ، کسی کا دل مت دُکھاؤ اور کسی سے لڑو نہیں ، سب سے محبت کرو ۔ "

" ہاں کتابوں میں یہی لکھا ہے ! "

پھر انھوں نے کوئی بات نہیں کی ۔ ہم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ پتا جی کے چہرے پر وہی غم اور اداسی کی سیاہ پرچھائیاں تیر رہی ہیں اور وہی پتھریلا پن سارے جسم پر چھا گیا ہے اور وہ ایک دم اجنبی ، غیر اور دور ہو گئے

ہیں۔

پاروتی کئی دن کھڑکی میں دکھائی نہیں دی۔ مشین کی آواز بھی سُنائی نہیں دی۔ پھر ایک شام گوگی سے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اور اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن ماں کا ڈر تھا۔ وہ ٹانگیں توڑ دے گی۔ میں نے ایک شام پتاجی کے ساتھ سیر کرتے ہوئے کہا:

"پتاجی، پاروتی کو بخار آرہا ہے۔"

وہ دور افق پر پھیلی درختوں کی سیاہ قوس کو دیکھ رہے تھے۔ میری بات سُن کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی انگلیوں میں لرزہ محسوس کیا اور ان کے چہرے پر جیسے کچھ پگھل رہا تھا۔ وہ پھر درختوں کی اس قوس کو دیکھنے لگے۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ واپسی پر ہم مندر گئے۔ پتاجی نے باہر سے آٹا لیا اور مچھلیوں کو گولیاں بنا بنا کر ڈالنے لگے اور میں اندر چلا گیا۔ جب میں باہر آیا تو پتاجی مندر کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ کہا نہیں۔

"میں نے بھگوان سے کہا ہے کہ وہ پاروتی کو جلدی سے اچھا کردے۔"

پتاجی خاموش رہے، صرف ان کے ہاتھوں کا دباؤ میرے شانے پر قدرے بڑھ گیا اور وہ جیسے پگھل پگھل کر میرے وجود میں سرایت کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"پتاجی، آپ مندر میں کیوں نہیں جاتے۔"

"بڑا ہو کر آدمی سچا نہیں رہتا۔ اسے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"بھگوان سے؟"

"نہیں، اپنی کمزوریوں اور گناہوں سے کہ وہ جو دکھائی نہیں دیتا سب کچھ دیکھتا ہے۔"

"پاپ کیا ہوتا ہے پتاجی؟ ماں کہتی ہے بتاشے اُٹھا کر کھانے سے پاپ لگتا ہے اور آدمی نرک میں جاتا ہے۔"

"پاپ وہ ہے جو تم ٹھیک سمجھتے ہوئے بھی نہ کرو۔ اور جن میں صحیح قدم اُٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ پاپی ہوتے ہیں اور اس دُنیا میں نرک بھوگتے ہیں اور دُکھی رہتے ہیں۔"

دوسرے دن شام کو میں پاروتی کے ہاں چلا گیا۔ ماں کی ناراضگی کا ڈر ایک لمحے کے لیے سانپ کی طرح پھنکارا تھا لیکن میں نے اس کا سر کچل دیا۔ پاروتی کے کمرے میں زرد اور مدھم روشنی والی لالٹین جل رہی تھی جس سے کمرے کی اُداسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پاروتی دیوار کے ساتھ چارپائی پر کمبل لپیٹے پڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد، ہونٹ خشک اور بال بکھرے سے تھے، سوکھی گھاس کی طرح اُلجھے ہوئے۔ وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر پکارا:

"پتو!"

میں اس کے قریب چلا گیا اور بستر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پاروتی نے کمبل سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے بستر پر بٹھا لیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ میں پاروتی کے وجود کا ایک حصہ ہوں اور وہ بے چینی، وہ بھٹکن جو میرے دل، میری روح میں تھی اس کے چھو دینے سے ایک دم دُور ہو گئی ہے اور اندر اور باہر ایک خوشگوار سکون اور توازن ہو گیا ہے۔

"کل مَیں نے مندر میں پرارتھنا کی تھی کہ تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔"
"کیوں؟"
مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ مَیں خاموش بیٹھا رہا اور اس کی نرم انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کرتا رہا۔ اس نے شاید اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی تھی:
"تمھاری ماتا جی کو معلوم ہو گیا تو؟"
"نہیں معلوم ہو گا، پتا جی ماں سے کبھی نہیں کہیں گے۔ ماں ان سے لڑتی ہے۔ پہلے پتا جی کسی کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے اب صرف مجھے ساتھ لے جاتے ہیں اور بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے ڈر لگتا تھا، اب نہیں لگتا۔ وہ باہر جا کر باتیں کرتے ہیں، گھر میں بالکل نہیں بولتے۔"
"کیا باتیں کرتے ہیں؟"
مجھے پوری طرح ان کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آئی تھیں اور جو سمجھ آیا تھا شاید اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس لیے میں پھر چپ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں خاموشی رہی پھر مَیں نے کہا:
"ماں کہتی ہے تم بہت بری ہو اور ہماری دشمن بھی۔"
وہ چھت کو دیکھتی ہوئی ہنس دی۔ پھر بولی:
"پھر یہاں تم کیوں آئے ہو؟"
"مجھے تم اچھی لگتی ہو۔"
پاروتی نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ کئی منٹ اس طرح گزر گئے، پھر اس نے وہی بات کہی جو پتا جی نے کہی تھی اور میں حیران ہوا تھا کہ دونوں نے ایک ہی طرح کیسے سوچا تھا۔
"تم نے میرے لیے پرارتھنا کی ہے نا! ماں کے لیے بھی کرنا۔"
پھر وہ میرے اسکول اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگی اور یہ کہ میں پڑھ کر کیا بنوں گا اور کیسے رہوں گا اتنی دلچسپی سے ماں نے کبھی پوچھا تھا اور نہ پتا جی نے اور نہ مجھے ہی معلوم تھا کہ مستقبل میں مجھے کیا کرنا ہے۔ اس روز پاروتی کی دوا لینے میں گیا۔ واپسی پر ماں نے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا بھی دوا کس کی ہے، لیکن میں جواب دیے بغیر بھاگ آیا اور دوا پاروتی کو دے کر گھر چلا گیا۔ ماں اس وقت پتا جی کے سامنے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور تھانیداروں کی طرح بول رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ پاروتی کا اور میرا نام بھی لیا تھا۔ اس سے مَیں سمجھ گیا تھا کہ وہ میرا ہی ذکر کر رہی ہے۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا کہ ماں نے دیکھ لیا اور لپک کر مجھے گردن سے دبوچ لیا۔
"جا کہاں رہا ہے، ادھر آ۔" وہ مجھے گھسیٹ کر پتا جی کے سامنے لے آئی۔
"جا اسے جان سے مار دے، مجھ سے کیا کہتی ہے، میں کیا کروں؟" پتا جی نے نہایت لاتعلقی اور بےزاری سے کہا۔
"جان سے تو تم مجھے مارو گے۔" ماں پھنکاری۔ "اسے اور سر چڑھاؤ اور ساتھ لیے لیے پھرو۔ خوب میرے خلاف سکھاؤ۔ تمھیں چین ہی اس دن آئے گا جب میری ارتھی اٹھے گی۔ اِتنے اِتنے بچوں سے میری بے عزتی کراتے ہو۔"
ماں آنکھوں پر پلو رکھ کر رونے لگی۔ دیدی اور بھیا بھی آ گئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگے۔

”کیوں گیا تھا وہاں؟“ پتا جی نے کڑک کر پوچھا۔ میں سہم گیا۔ پہلی مرتبہ وہ اس طرح کڑکے تھے۔ ان کے نتھنے پھول رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اور چہرہ دہک رہا تھا۔ انھوں نے پورے زور کا تھپڑ میری گال پر جڑ دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ ”کون لگتی ہے وہ تیری؟ کیوں گیا تھا وہاں؟“ پتا جی نے حقے کی نے نکال لی تھی اور دھڑا دھڑ مجھ پر برسانے لگے تھے اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے: ”کون لگتی ہے وہ تیری؟“ وہ مجھے اس وقت تک مارتے رہے جب تک کہ نے ٹوٹ نہیں گئی۔ ماں نے رونا بند کر دیا تھا اور دہشت زدہ سی بیٹھی مجھے تکے جا رہی تھی۔ پتا جی نے پھینک کر ٹکڑے ٹوٹے سے کرسی پر گر پڑے تھے ان کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ان پر بے اختیار پیار آ گیا اور ماں پر شدید غصہ۔

”کتنی بے دردی سے مارا ہے بچے کو۔“ ماں دیوار سے لگی کھڑی کہہ رہی تھی۔ ”اس رانڈ سے پوچھو جا کر جو میرے پیچھے پڑی ہے۔ اس کے تن بدن میں کیڑے پڑیں۔ سات جنم اندھی ہو۔“

”بکواس بند کرو۔“ پتا جی چیخے۔

پہلی مرتبہ مَیں نے انھیں گھر میں اس طرح بولتے سنا تھا۔ ایک دم ماں خاموش ہو گئی تھی اور گھر پر سناٹا چھا گیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ اس طرح گرجے تھے۔ میں بمشکل تمام خود کو سنبھالتا ہوا بستر پر جا کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ پتا جی کوٹ پہن کر جب چلے گئے تو ماں دیر تک پاروتی کو کوستی رہی۔ میں بستر پر پڑا رہا۔ میرا تمام بدن دکھ رہا تھا اور جل رہا تھا اور مَیں چاہ کر بھی نہیں رو پا رہا تھا، جیسے آنسو خشک ہو گئے ہوں۔

اس روز پتا جی بہت دیر سے لوٹے۔ دیر تک ان کے قدموں کی آواز کمرے میں سنائی دیتی رہی، جیسے وہ جلدی جلدی چکر لگا رہے ہوں۔ گھر پر سناٹا چھایا تھا۔ ماں اس وقت میانی میں جا سوئی تھی۔ مَیں جاگ رہا تھا۔ پھر وہ بھاری قدم مجھے اپنی طرف آتے محسوس ہوئے۔ میں دَم سادھے پڑا رہا۔ میں نے بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کہ پتا جی مجھ پر جھکے کھڑے ہیں اور غور سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے میرے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجھے لگا کہ وہ جلن، وہ درد ان کی انگلیوں نے باہر کھینچ لیا ہے اور مَیں بھلا چنگا اور پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہوں۔ وہ آنسو جو خشک ہو گئے تھے آپ سے آپ میری آنکھوں میں آ گئے اور گالوں پر سے گردن پر بہنے لگے۔ میں آنکھیں نہیں کھول سکا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پتا جی کا چہرہ اُترا ہوا اور اُداس ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا۔ پھر وہ اُٹھ کر اندر چلے گئے اور اس رات بھوک کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

کئی دن میں اسکول نہیں گیا، کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ان دنوں ماں پتا جی سے لڑی بھی نہیں لیکن فضا زیادہ بوجھل اور سرد سی رہی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ پاروتی کیسی ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پتا جی اُن دنوں اور بھی دُور ہو گئے تھے۔ وہ سر لٹکائے خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہتے یا پڑھتے رہتے تھے۔ وہ دُور سے مجھے دیکھ کر چلے جاتے۔ پھر جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ سیر کرنے لے گئے اور مَیں بھول گیا کہ انھوں نے مجھے مارا تھا۔ نہر کی پٹری پر خشک، بھورے پتّوں پر چلتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: ”بیرونی مار سے اندر کی مار زیادہ خطرناک ہوتی ہے، وہ مار جو ضمیر مارتا ہے —— یہ مار تم نے برداشت کر لی، ضمیر کے خلاف کچھ نہ کرنا کہ اس کی مار برداشت نہیں کر سکو گے!“

اسکول کے سال ختم ہوتے گئے اور میں پاروتی سے بے دھڑک ملنے لگا۔ اس کے بالوں میں سفید تار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اب بھی بال کھلے رکھتی تھی۔ میں نے اس سے ایک آدھ مرتبہ پوچھا بھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے، لیکن اس نے کبھی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہنس کر کہتی:

"پپو، تو یہ سب کچھ کیوں پوچھتا ہے ؟"
"مجھے اب پپو مت کہا کرو۔"
"کیوں رے ؟ تو کیا بدل گیا ہے ؟"
"ہاں، اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"
"ہو گیا ہو گا اپنے لیے، میرے لیے تو وہی پپو ہے، جو کانچ چبھ جانے سے رو دیا تھا۔"

اور ہماری باتیں اس طرح بھٹک جاتیں اور میرا وہ سوال سوال ہی رہ جاتا۔ ماں اب زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ دیدی کی شادی ہو گئی تھی اور بھیا ہوسٹل میں چلا گیا تھا۔ ماں جیسے تھک گئی تھی، لیکن پتا جی کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہی طویل سیر اور گھر میں آرام کرسی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانا۔ میں کالج پہنچ گیا تھا۔ اب پتا جی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھیں تو انھوں نے بات کرنا کم کر دیا تھا۔ میری زندگی بھی گھر کی چار دیواری سے باہر پھیلی وسیع دنیا میں غوطے لگا رہی تھی اور سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز، ہر رشتے کے معنی بدل رہے تھے، روپ بدل رہے تھے۔ باہر سے تو وہی روپ تھا لیکن اندر سے کچھ اور نظر آنے لگا تھا۔ گھر میں میری دلچسپی کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سارا گھر پرانے کلنڈر کی طرح لگتا تھا۔

میں اب پاروتی کے ہاں بھی کم ہی جاتا تھا۔ یار دوستوں، کھیل تماشوں سے فرصت کہاں ملتی تھی۔ لمبے عرصہ کے بعد پاروتی سے ملتا تو وہ بہت اداس اور خالی خالی سی ملتی اور ایسی باتیں کرتی جیسے تیاگ اور تپسیا کے مراحل سے گزر رہی ہو۔

یہ کیا ہو رہا ہے۔ سب ہی بدل گئے ہیں۔ ماں، پتا جی، پاروتی اور میں بھی۔

جب ایک شام ہاکی کا میچ کھیل کر میں گھر آیا تو معلوم ہوا کہ پاروتی بیمار ہے۔ میں گھر نہ جا کر سیدھا ادھر ہی چلا گیا۔

پاروتی کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس پر لحاف ڈال دیا۔ جب میں نے اس کی پیشانی چھوئی تو بخار تیز تھا۔

"تمھاری طبیعت خراب ہے۔"
"بیٹھ جا۔" اس نے مجھے بستر پر ہی بٹھا لیا۔

کمرہ بہت گندہ ہو رہا تھا۔ فضا میں سیلن اور میلے کپڑوں کی بو تھی۔ اندھیرا تھا۔ لالٹین جل رہی تھی لیکن چمنی صاف نہ ہونے کے کارن روشنی نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر چمنی صاف کی، لالٹین میں تیل ڈالا۔ کھڑکی کھولی۔

"یہ سب تو کیا کر رہا ہے، بیٹھ جا میرے پاس۔"
"اتنی گندی جگہ ——— بیمار نہیں ہو گی تو کیا ہو گا۔"
"برسوں سے تو اس کمرے میں رہ رہی ہوں، یونہی بخار آ گیا، ٹھیک ہو جاؤں گی۔"
"کس کا علاج چل رہا ہے ؟"
"یہ ہومیو پیتھک پڑیاں منگوائی تھیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کئی دن سے بیمار ہے، کام بند پڑا ہے اور اس کے پاس پیسے نہیں۔

"مجھے کیوں نہیں بلوا لیا، کہلوایا کیوں نہیں ؟"

"کیا کہلواتی رہے!"

"تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔"

"کیا بک رہا ہے رے، تو مجھ سے لڑنے آیا ہے۔ بیٹھ جا میرے پاس، مجھ سے زیادہ بولا نہیں جاتا، درد ہوتا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا لیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ میں کسی انجانے خوف سے ڈر گیا۔

"تم ——" میں نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں ایک دم اُٹھ کر آ گیا۔ وہ آواز دیتی رہ گئی۔ جب میں ڈاکٹر کو لے کر لوٹا تو وہ دیوار کی طرف مُنہ کیے پڑی تھی۔ میری آواز پر اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر بولی:

"تو یہ سب کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ یہ تو یونہی پریشان ہو گیا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب، آپ ان کا اچھی طرح معائنہ کیجیے۔"

جب میں ڈاکٹر کا بیگ تھامے اس کے ساتھ باہر نکلا تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب، کوئی خطرہ تو نہیں۔"

"نہیں خطرہ تو خاص نہیں، پھر بھی آپ کسی ٹی۔ بی ایکسپرٹ سے بات کر لیجیے۔ سب Test ہو جانے چاہییں، مجھے ان کے پھیپھڑوں میں نقص معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر سے فارغ ہو کر میں اندر گیا تو پاروتی بولی:

"یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیا کہتا ہے ڈاکٹر ——؟"

"کچھ نہیں۔"

"اچھا اب تو میرے پاس بیٹھ۔"

"تم اس کمرے میں نہیں رہو گی۔"

وہ مسکرا دی، پیلے ہونٹوں پر پیلی سی مسکراہٹ۔

"تو کہاں رکھے گا مجھے۔"

یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنے گھر تو لے جا نہیں سکتا تھا۔ میں جیسے شرمندہ ہو گیا، میرا سر جھک گیا۔

"پگلا اُداس ہو گیا۔ جب تو اپنا مکان بنالے گا تو میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ تیری بہو کے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے اور بے جان سے تھے۔ مجھے روح کی گہرائی میں شدید دُکھ کا احساس ہوا۔ میں پاروتی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اچانک خیال آیا کہ میں مل ملا کر اسے کسی سینی ٹوریم میں تو داخل کرا سکتا ہوں، لیکن اس خیال نے احساسِ شکست اور بھی شدید کر دیا۔

میرا ہاتھ تھامے وہ چُپ چاپ پڑی تھی۔ میں لالٹین کی زرد روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا، چمنی پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔

"کل میں اسے اچھی طرح سے صاف کر دوں گا۔"

"کسے؟"

"لالٹین کی چمنی کو۔"

اُس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ میں ڈر گیا۔
" درد ہو رہا ہے ؟ "
" تو اب بہت کم آتا ہے ۔" وہ ایک دم بولی ۔" اچھا ایک بات بتا اگر میں مر گئی تو تُو مجھے یاد کیا کرے گا ۔"
" ایسی باتیں کرو گی تو میں ابھی چلا جاؤں گا ۔"
" ہاں چلا جا ، ابھی چلا جا ، اب بڑا ہو گیا ہے نا ۔"
" نہیں ، نہیں جاؤں گا ، لیکن بھگوان کے لیے ایسی اشبھ باتیں مت کرو ۔"
اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ جب اُس کے آنسوؤں کا گرم لمس اپنی گردن پر محسوس کیا تو میں چونکا۔
دوسرے دن شہر کے ٹی ۔ بی ایکسپرٹ سے ملا ۔ تیسرے دن زبردستی پاروتی کو اُسے دکھانے لے گیا۔ پہلے ڈاکٹر کا خدشہ ٹھیک نکلا ۔ پاروتی کے دونوں پھیپھڑے متاثر تھے ۔ اگلے دن میں نے اُسے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہ اس کے لیے راضی نہیں تھی لیکن اور کوئی راستہ نہیں تھا۔
جس وقت میں نے ایمبولینس گاڑی کے لیے فون کیا، پتا جی کمرے میں چکّر لگا رہے تھے ۔ بار بار وہ سیڑھیوں کی طرف جاتے، پھر لوٹ آتے ۔ آخر کرسی پر ڈھیر ہو گئے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اتنا تھکا ہوا اور اُداس میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
تین چار دن ان کی ایسی ہی حالت رہی ۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ گھر میں خاموشی اور بھی گہری ہو گئی تھی ۔ ماں جو تھک کر اپنے میں سمٹ گئی تھی، پھر تر و تازہ محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ غور سے پتا جی کی طرف دیکھتی جیسے انکے چہرے ان کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو ۔ پتا جی آنکھیں موند لیتے، سر جھکا لیتے اور ماں پوجا کے کمرے میں چلی جاتی اور دیر تک گھنٹی بجاتی رہتی ۔ مجھے دن میں دو بار اسپتال جانا پڑتا۔
ایک دن جب ماں گھنٹی بجا رہی تھی، پتا جی میرے پاس آئے اور سَو سَو کے کئی نوٹ میرے سامنے رکھ دیے اور یہ کہہ کر چلے گئے ۔" تجھے ضرورت ہو گی ۔"
اسی شام پاروتی نے پران تیاگ دیے ۔ اُس سمے مَیں اُس کے پاس ہی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن موت نے اُسے اس کی بھی مہلت نہیں دی ۔ اُس کا برف سا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور بال تکیے پر کھلے پڑے تھے۔
پاروتی کی استھیاں میں نے جل پرواہ کی ہیں ۔ اب اس کی یاد باقی ہے ۔

گھاٹ سُنسان ہے اور ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد سی بتی بالکل اکیلی سی لگ رہی ہے ـــــــ لیکن وہ سلاخوں والی کھڑکی اب بند ہو گی ۔ بچّے تو اب بھی وہاں کھیلتے ہوں گے لیکن کوئی انھیں سوئی تاگا لانے کے لیے نہیں کہتا ہو گا۔
کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے ۔شاید چوکیدار ہو ۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔
چوکیدار نہیں ـــــ پتا جی ہیں ۔

وہ دھیرے دھیرے بہتی گنگا اور اس پر جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ رہے ہیں اور میں ان کی آتما میں جھانک رہا ہوں کہ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں - لگتا ہے میرے سامنے ایک ساز ہے جس کا تار بجتے بجتے ٹوٹ گیا ہے اور ایک پُرسوز جھنکار فضا میں پھیلتی جا رہی ہے۔

بہت دیر ہو گئی ہے ———

فصیلِ جسم سے آگے...

اُنیسویں صدی کے فرانسیسی ناول نگاروں کے کردار، احساسِ آزادی اور اپنے وجود پر اِستدلال کرنے والے کردار تھے۔

شرون کمار ورما نے "فصیلِ جسم سے آگے..." میں ایسا ہی ایک کردار تخلیق کیا ہے —— مینی! مینی ایک اسرار ہے جس کے مقابل سوسن ایک شفاف آئینے کی طرح موجود ہے۔ سوسن میں مصالحت، خود سپردگی، اور مادّی طرز کی بے حسی ہے لیکن مینی افسانہ نگار کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے —— اس کردار میں کتنے ہی اسرار چھپے ہیں لیکن ایک بات بہت نمایاں ہے کہ وہ اپنے وجود کے آزادانہ احساس اور اپنے جذبات و شعور کی خود مختاری کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہے۔ قدم قدم پر ایسے مرحلے آتے ہیں، جب محسوس ہوتا ہے کہ اس بار شاید افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلابت کو برقرار نہ رکھ سکے گا۔ لیکن مینی کی تخلیق اور تکمیل میں افسانہ نگار نے گستاؤ فلابیئر کے انداز میں لوہے کے چنے چبائے ہیں اور اپنے کردار کی صلابت کو قائم رکھا ہے۔ افسانے میں ایک مرحلے پر مینی اور کہانی کا میں، پہلی بار ایک دوسرے کے قریب ہیں:

جب چاروں طرف رات کی پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور چاند بہت دور چلا گیا تھا، اور ستاروں بھرا نیلا آسمان درختوں پر جھک آیا تھا اور ایک ستارہ ننھا ننھا پتوں کی چھت سے جھانک رہا تھا...

. . . نہ جانے کب مینی میرے شانے سے آلگی تھی۔ میرا بازو آپ سے آپ اس کے گرد پھیل گیا تھا —— جیسے وہ روح کی تنہائی، وہ ٹیس، اس ایک پل میں ہم دونوں نے ایک ساتھ محسوس کی ہو۔

مینی کی اس سپردگی میں اس کی روح کا کرب ایسے سمٹ آیا ہے، جیسے جاڑوں کی سرد ویران رات میں کسی چرچ کے وسط میں کرائسٹ کی شبیہ کے مقابل لرزتی ہوئی کوئی لڑکی اپنی روح کا اضطراب اور اپنے گناہوں کا احوال خاموشی کی زبان سے بیان کر رہی ہو۔

مینی روح کا اضطراب ہے، آزادی اور خود مختاری کا مقدس مجسمہ ہے —— اسے گناہ اور ثواب کے تصور اور اپنی آزادی کے درمیان بھی ایک کشمکش محسوس ہوتی ہے۔ وہ سوال کرتی ہے:

«جس زمانے میں مذہب تھے ہی نہیں —— صرف انسان تھا، اور اس کی ضروریات زندگی تھیں —— تب؟ اور اب گناہ کون کر رہا ہے؟»

ایک اور جگہ اپنی ناکتخدا بہن کے بارے میں مینی سوال کرتی ہے:

«اگر نیک مریم پاک ہو سکتی ہے تو سوسن کیوں نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کل سوسن کے پیٹ سے کوئی کرائسٹ پیدا ہو!»

مینی کے ذہن میں طوفان اٹھانے والے یہ سوالات، اسے اس عہد کے بہت سے اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی مسائل کا پیکر بنا دیتے ہیں۔ کچھ لمحے آتے ہیں، جب وہ خود کو دوسرے کے سپرد کر دینے کے لیے آمادہ ہوتی ہے تب اچانک، اس کا وجود اور اس کی وجودی غیرت بیدار ہو جاتی ہے۔ ایک رات، جب افسانے کا "میں" نشے میں مدہوش ہے، وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رات گزارتی ہے۔ اپنی وابستگی کے بدلے وہ چاہتی ہے کہ اس کے مقابل جو مرد ہے، وہ اس پر اپنا حق محسوس کرے لیکن مقابل کی بے حسی اس کے ذہن اور شعور میں سلگتے ہوئے بغاوت کے شعلے کو ہوا دیتی ہے، اور وہ بے تحاشا اپنے محبوب کو مارنے لگتی ہے۔

مینی اس عہد اور اس سماج کا مسئلہ ہے —— معزز لوگوں کے سماج میں اپنے لیے آزادی کے ساتھ اپنا حق اور اپنی شناخت کو قائم کرنے کا مسئلہ۔

مینی جس بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری دنوں کی شدت کو طوفانی انداز میں بسر کرتی ہے اور جس طرح جرأت و جسارت کی منزلیں طے کرتی ہے، اور جس طرح خودکشی کے ذریعے اپنی زندگی، اپنے حوصلے، اپنی آزادی اور اپنے وجود کے اثبات کا اعلان کرتی ہے، اسے شرون کمار ورما کی تخلیقی صلاحیتوں کا وہ مجسمہ کہا جا سکتا ہے جس میں کنواری مریم کی روح کو تلاش کیا گیا ہے۔

محمود ہاشمی

ڈیلیا، گلاب، سورج مکھی، للی ـــــــ بہت سے پھولوں میں اگر ایک ننھا سا پھول نرگس کا بھی ہو تو ہر دیکھنے والے کی نظریں پل بھر کو اُس پر نظر ضرور ٹھہریں گی۔

اور اگر مس ہنس (جنھیں ہم سب آنٹی کہتے تھے) کے ڈرائنگ روم میں، صوفے کے ایک کونے میں خاموش، گمبھیر اور اداس سانولی سی ایک لڑکی کو دیکھ کر میں لمحہ بھر کو سوسن سے باتیں کرنا بھول گیا تو کیا عجب ہوا، حالانکہ اُس شام مَیں صرف سوسن سے ملنے گیا تھا۔ میرا خیال تھا اُس کے ساتھ کوٹھی سے ملحقہ باغ میں ٹہلوں گا اور جب چاند آسمان کے وسط میں آجائے گا تو لوٹ آؤں گا۔ سوسن مجھے کوٹھی کے گیٹ پر ہی مل گئی تھی اور ہم روش پر جھکی ٹہنیوں کو ہاتھ سے جھلاتے، باتیں کرتے، قہقہے لگاتے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

آنٹی اُس وقت صوفے کے کونے میں بیٹھی انگریزی کا کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ دوسرے کونے میں وہ سانولی پتلی سی لڑکی بیٹھی تھی: گھٹنے پر گھٹنا رکھے، صوفے کے چوڑے بازو پر کہنی ٹکائے، ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے - وہ جیسے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اُس کی عمر زیادہ سے زیادہ اُنیس سال کی ہوگی۔ اُس سمے اُس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا، جس میں وہ بڑی پیاری، گڑیا سی لگ رہی تھی۔ اُس کے بال شانوں تک کٹے تھے۔ چہرہ لمبوترا تھا۔ اُسے پتلی کہا جا سکتا تھا، کمزور نہیں۔ وہ گیلی مٹی تھی جسے چاک کی گردش اور کمہار کے تجربہ کار ہاتھ خوبصورت شکل دیتے ہیں۔

سوسن نے جب مجھے اُس میں دلچسپی لیتے دیکھا تو ہنس کر بولی:

"مس منی، کل ناگپور سے آئی ہے۔"

اُس لڑکی نے اپنے خیالات سے نکل کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں کسی قسم کی گرمی نہیں تھی۔ بس جیسے میوزیم میں کچھ دیکھ رہی ہو۔ اُس کا رنگ گو سانولا تھا پھر بھی مجھے ناگپور کے سنگترے یاد آنے لگے اور میری زبان پر اورنج جوس کا میٹھا اور ترش ذائقہ تازہ ہونے لگا۔

مَیں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے اس پر بھی کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جو وہاں کی کسی بھی لڑکی سے خلافِ توقع تھا۔ بے دلی سے سرد اور بے جان سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اُسے عورت کا ہاتھ محض اس لیے کہا جا سکتا تھا کہ باقی جسم ابھی خاصی لڑکی کا تھا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر مجھے ایسا احساس ہوا جیسے وہ ہاتھ ملاقاتی کے لیے ریفریجریٹر سے نکالا گیا ہو۔ میں نے نہایت آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبایا، جیسا کہ ایسی ملاقاتوں کا دستور ہوتا ہے۔ اُس نے بڑی ٹھنڈی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔

میں من ہی میں مسکرایا۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں آنٹی کے ہاں مَیں متعدد لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ وہ سب کی سب انوکھی تھی۔ باقی تو پہلی ہی ملاقات میں کھل جاتی رہی تھیں۔ اُس کا ہر انداز نرالا تھا۔ شاید اسی لیے میں اُس میں ایک کشش سی محسوس کرنے لگا۔ جیسے بند دروازے کے پیچھے جھانکنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن میں ایک خیال سے مطمئن تھا۔ آنٹی کے ہاں دیر ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔

"اتنے دنوں کہاں رہے؟" آنٹی نے پرچے سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

"جہنم میں۔" میں نے جواب دیا۔

"دل تو لگ گیا ہوگا۔" سوسن نے کہا اور شرارت سے مسکرائی۔

"آپ نے کچھ نہیں کہا۔" میں نے منی کو بیچ میں گھسیٹنا چاہا۔

"ضروری ہے کیا؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کا موڈ کچھ خراب ہے۔" سوسن نے بتایا۔

"ابھی ٹھیک ہوا جاتا ہے۔" مَیں نے بے تکلّف ہونے کی کوشش کی اور اوور کوٹ کی جیب سے وسکی کی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔ "ہر مرض کا علاج ہے۔"

"منی نہیں پیتی۔" آنٹی بولیں۔

"کیوں؟" میں نے منی کی طرف دیکھا۔

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" منی نے جواب دیا اور اُٹھ کر چلی گئی۔

اُس روز ہم تینوں نے دو دو چھوٹے پیگ پیے۔ بعد میں مَیں اور سوسن باغ میں ٹہلنے چلے گئے۔ وہ ہنس ہنس کر منی کے بارے میں بتاتی رہی کہ وہ بہت جذباتی لڑکی ہے۔ اُس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ابھی خوش، ابھی روٹھ جائے گی۔ لڑے گی اور رونے لگے گی۔ عجیب لڑکی ہے۔

"وہ اس ماحول اور اس جگہ کے لیے نہیں بنی شاید۔" میں نے کہا۔

سوسن نے میری طرف دیکھا، پھر سامنے درختوں کو دیکھنے لگی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اُس کا بازو آہستہ سے دبا کر پوچھا۔

اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی اور بے بسی کی جھلک تھی۔ وہ نظریں جھکا کر بولی:

"کوئی بھی منی کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔" اُس نے ایک جھکی ہوئی شاخ سے پتا توڑ لیا اور اُسے انگلیوں میں مسلنے لگی۔ "مَیں اس کی بڑی بہن ہوں، پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتی کہ اُسے پوری طرح سے سمجھ سکی ہوں۔ سوچتی ہوں، سمجھ نہیں سکی۔"

"تمھاری چھوٹی بہن ہے ——— سگی!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں، کیا نہیں ہو سکتی ہے؟" وہ ہنسی، جیسے خود اپنا مذاق اُڑا رہی ہو۔ پھر کہنے لگی: "بالکل سگی۔ ایک ماں اور ایک باپ کی دو لڑکیاں۔ مجھ سے مختلف ہے ——— ہے نا! وہ چودہ سال کی تھی جب ایک چالیس سالہ آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ دوسرے روز صبح ہی لوٹ آئی۔ بہت دنوں اُس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کس کے

ساتھ گئی تھی۔ ممی نے مار مار کر بدن سُجا دیا لیکن وہ نہیں بولی۔ پھر ایک رات آپی میرے بستر پر آئی اور سب کچھ بتا دیا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ میں تو سُن کر حیران رہ گئی۔ جس شخص کے ساتھ وہ بھاگی تھی اُسے بہانے سے اس کے کمرے میں بند کر کے ساری رات اُس کے سولہ سالہ لڑکے کے ساتھ رہی۔ اور جب ممی نے اُسے ایک نوجوان کے ساتھ جانے کے لیے کہا تو صاف انکار کر دیا۔ ہے نا عجیب بات۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اُسے کسی کام کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی مرضی سے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ جگہ اسے کبھی بھی سوٹ نہیں کرے گی۔"

"وہ یہاں شاید کبھی نہ آتی ——— لیکن ———" سوسن نے کہا۔

"لیکن ——— ؟" مَیں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ممی کو عمر قید کی سزا ہو گئی ہے۔ اکیلی وہ وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔"

"سزا؟ کیوں؟" میں حیران رہ گیا۔

سوسن نے میری طرف دیکھا اور بولی: "قتل کے جرم میں۔"

چند منٹ ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا: "منی یہاں رہے گی تو . . ."

سوسن میرا مفہوم شاید سمجھ گئی۔ بولی: "اسی راستے پر چلنا ہو گا۔"

میں نے سوسن کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کنج میں پھیلے ہوئے اندھیرے کو گھور رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں واپس آ گیا۔

گو منی وہاں رہ رہی تھی لیکن وہ اُس ماحول میں اجنبی سی تھی۔ اپنی عادات کی وجہ سے یا محض ضد کی وجہ سے شروع شروع میں وہ مجھ سے دُور رہنے کی کوشش کیا کرتی۔ اس انداز میں معشوقانہ دلربائی یا شوخی نہیں تھی، ایک طرح کی طفلانہ ضد تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری دلچسپی اُس میں روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ لیکن اس میں جنسی جذبے کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا کہ اس کی شخصیت میں جھانک کر دیکھنے کو۔ میرے سوسن یا آنٹی سے بھی جنسی تعلقات نہیں تھے۔ آنٹی تو عمر کی اُن حدود میں داخل ہو چکی تھیں جہاں ایسی باتوں کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوسن سے واقفیت ہوئی تو بجائے جنسی راستے پر چلنے کے دوستی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ ہم آپس میں اس قدر کھل کر باتیں کر لیتے کہ کبھی دوسری طرف خیال ہی نہیں گیا۔ سوسن اپنے خالصتاً ذاتی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ کرتی۔ کئی بار تو میں بے ساختہ ہنس دیا کرتا اور وہ حیران سی میری طرف دیکھتی رہ جاتی۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

"تم یہ سب مجھے کیوں سُنا رہی ہو!"

"تم سنتے جو ہو۔"

"اچھا، آئندہ نہیں سُنا کروں گا۔"

"کیسے نہیں سُنا کرو گے۔" وہ بڑی معصومیت اور غصّے سے کہتی۔

اُس سمے وہ مجھے بڑی پیاری لگتی۔

جب ایک نوجوان نے، جو کچھ دنوں سے وہاں باقاعدہ آنے لگا تھا، سوسن سے شادی کی پیش کش کی تو وہ سرِدست کوئی جواب نہ دے سکی۔ بعد میں اُس نے مجھ سے ذکر کیا اور رائے چاہی۔ وہ حیران تھی کہ اُس نوجوان نے اُس کے ماضی و حال کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی، یہ پیش کش کیسے کردی۔ وہ سنجیدگی سے اس پر تیار بھی ہوگئی تھی۔ میں اُس نوجوان کو جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اُسے وہاں سے نکال کر اپنا ذریعۂ معاش بنانا چاہتا تھا۔ میں نے سوسن کو یہ بات وضاحت سے سمجھا دی۔ اُس رات وہ دیر تک روتی رہی۔ کئی دن تک اُداس رہی اور آخر اُس نے وہ پیش کش ٹھکرادی۔ اُس نوجوان نے وہاں آنا جانا بند کر دیا۔

ایک شام جب میں وہاں پہنچا تو سوسن اور آنٹی گھر میں موجود نہیں تھیں۔ نوکر نے بتایا کہ منی اپنے کمرے میں ہے۔ میں سیدھا وہیں چلا گیا۔

وہ تکیے پر سر رکھے چت لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں پہلے تو کھڑا دیکھتا رہا، پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا —— دیکھوں وہاں کون سی ایسی چیز ہے جو اُسے اپنی طرف متوجہ کیے ہے —— چھت پر کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بہت حیران ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس نے چھت پر نظریں جمائے کہا: ”آنٹی اور سوسن گھر پر نہیں ہیں۔“

”اور تم؟“

”میں!“ اس مرتبہ اس نے میری طرف دیکھا اور بچّوں کی طرح قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی: ”تمھارا کیا خیال ہے؟“

”تم بھی نہیں ہو۔“

”تو یہاں کس لیے بیٹھے ہو؟“

”تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”اچھا کرتے رہو۔ جب اُکتا جاؤ تو اُٹھ کر چلے جانا۔“

”میں گئے ہوؤں کو واپس بھی لا سکتا ہوں۔“

”اچھا!“ وہ بچّوں کی طرح حیرت سے بولی، جیسے جادوگر کی کہانی سُن رہی ہو۔ ”کیسے؟“

میں اُٹھ کر اُس کے بستر پر جا بیٹھا۔ وہ چت لیٹی تھی اور اُس کے بدن کے تمام خطوط، خم اور اُبھار نمایاں ہو گئے تھے۔ سیاہ ریشمی پلکیں آنکھوں پر اس طرح جھکی جھکی سی تھیں کہ اُن کی نشیلی کیفیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گلابی گلابی ہونٹ، چھوٹی سی ناک، بھرے بھرے گال، تکیے پر بکھری ہوئی زلفیں، چکنی ملایم جلد —— جیسے کوئی تازہ پھل ہو۔

”تمھارے پاس سگریٹ ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”دو مجھے۔“

میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے بجائے اُنگلیوں میں تھامنے کے لب تھوڑے

سے کھول کر آگے بڑھا دیے۔ طبیعت مچل گئی۔ جی چاہا اُن ادھ کھلی کلی سے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دوں، لیکن ضبط کیے رہا خاموشی سے سگریٹ اُن میں پھنسا کر سُلگا دیا۔

اُس کے کش لینے اور انگلیوں میں تھامنے کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ سگریٹ کی عادی نہیں ہے۔ اُسے ڈھنگ سے کش لگانا بھی نہیں آتا تھا۔ میرا دل مچلنے لگا تھا اور ہاتھوں سے اختیار جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ شاید میری کیفیت بھانپ گئی تھی۔

بولی: "اب تم اپنی جگہ پر بیٹھو جا کر۔"

میں پھر کرسی پر آ بیٹھا۔ نہ جانے کیوں انکار نہیں کر سکا۔ وہ تکیے پر کہنیوں کے بل اُٹھ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر دھواں اُڑا کر بولی: "تم کہانیاں لکھتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور سوچا کہ اُسے سوسن سے معلوم ہوا ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اور بھی کچھ کہے گی، لیکن وہ اطمینان سے سگریٹ پیتی رہی جیسے سب کچھ بھول گئی ہو۔ یہ بھی کہ کوئی اُس کے کمرے میں بیٹھا ہے۔

میں بیٹھا بیٹھا بور ہونے لگا تو اُٹھ کر لکھنے والی میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میز پر مینی کا پرس پڑا تھا۔ ایک ننھا سا رومال۔ استعمال شدہ لپ اسٹک کا خالی سنہرا خول۔ گوگلز اور چند کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک پیڈ کھلا پڑا تھا جس پر شاید وہ خط لکھتے لکھتے درمیان میں ہی چھوڑ گئی تھی اور کچھ سوچنے کے لیے بستر پر جا لیٹی تھی۔ پیڈ پر کھلا ہوا قلم پڑا تھا۔ گو یہ اچھی عادت نہیں پھر بھی میں وہ خط پڑھنے لگا۔ کسی محبوب کو لکھا گیا تھا۔ اتنے خوبصورت، جاندار اور محبت بھرے فقرے لکھے گئے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ مینی نے لکھا ہے۔ اُن چند سطور کو پڑھ کر احساس ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں محبت اور خلوص کا جذبہ بے پناہ اور شدید ہے۔ یہی اُس کی زندگی ہے۔ میں نے ایک کتاب اُٹھالی۔ نام دیکھ کر ہی حیران رہ گیا۔ یہ شاید اُس خط کا ردِ عمل تھا۔ Make Young Men Die for You. میں نے ورق پلٹ کر دیکھے۔ اُس میں تصویروں کی مدد سے اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے اور بات کرنے کے ایسے طریقے سمجھائے گئے تھے جن کی وجہ سے نوجوان لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دوسری کتاب تھی Hundred and One Ways of Kissing. تیسری میری اسٹوپس کی Married Love تھی۔ چوتھی ایک جنسی ناول تھی جس کے سرورق پر ایک ننگی عورت کی تصویر تھی۔ ایک طرف Bible رکھی تھی۔ باقی کی کتابوں کے ساتھ انجیل کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نے مینی کی طرف دیکھا۔

وہ میری طرف نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بولی: "کسی لڑکی کے کمرے میں آ کر اُس کی چیزیں نہیں دیکھنا چاہئیں۔" میں شرمندہ سا ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر میرے قریب آ گئی اور ہنس کر بولی، جیسے کسی بچے کو بہلا رہی ہو، "اچھا دیکھ لو۔" اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"اِدھر آؤ ایک چیز دکھاؤں۔"

میں اُس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"وہ دیکھو،" وہ انگلی سے اشارہ کر کے بولی، "وہ گلہری کیسے دو ٹانگوں پر بیٹھی ہے؟ گلہری کی دُم بڑی ملایم اور نرم ہوتی ہے۔ دیکھی ہے کبھی؟"

میں بجائے گلہری کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر سنجیدگی سے بولی:

"میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ میں کوئی گلہری ہوں —— گلہری۔" اس نے دہرایا اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ "گلہری، میں گلہری ——" وہ بار بار کہتی اور ہنسنے لگتی۔ پھر وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ گلہری کی طرح منہ تک لے گئی۔ "اسی طرح کھاتی ہے نا! اچھا میری تصویر اُتارو۔ تمھارے پاس کیمرہ ہی نہیں ہوگا۔ چلو جانے دو۔" وہ پھر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور باہر دیکھنے لگی۔ ایک ٹہنی پر فاختہ بیٹھی تھی، اُسے دیکھ کر بولی:

"مجھے فاختہ بڑی پیاری لگتی ہے۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب درختوں یا ٹھنڈے برآمدوں میں بولتی ہے تو بڑا اچھا لگتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دی تھی۔ بیچاری اُداس ہو گئی۔ میں نے آزاد کر دی۔ تار پر بیٹھ کر بولنے لگی۔ جانتے ہو کیا کہہ رہی تھی۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"کہہ رہی تھی: تھینک یو! تھینک یو!"

چند لمحے پیشتر جو میرے دل میں اُس کے جسم کے حصول کے لیے جذبہ پیدا ہوا تھا تھکے ہارے مسافر کی طرح اُس کی معصومیت کی چھاؤں میں لاتیں پسار کر سو گیا۔ میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور سامنے دیوار پر آویزاں کرائسٹ کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ ہاتھ کی بنائی ہوئی تھی۔ میں نے صلیب پر لٹکے کرائسٹ کی بہت سی تصویریں دیکھی ہیں، لیکن اس میں کچھ اور ہی بات تھی۔ ایک عجیب سی کسک، درد اور غم کا احساس ہونے لگتا تھا اُسے دیکھ کر۔

"یہ تصویر تم نے خود بنائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میری ایک فرینڈ نے Present کی تھی۔ اچھی ہے؟"

"بہت۔" میں نے کہا، "بہت سے مذہبوں میں دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اور بُت ملتے ہیں لیکن جو قربانی اور ایثار کا تصور عیسائیوں نے پیش کیا ہے، اور جس طرح کرائسٹ نے جان دی، وہ بات اور کہیں نہیں ملتی۔ آسمان پر خدا کی طرف اٹھی ہوئی یہ نظریں، جن میں نہ موت کا خوف ہے نہ اپنی تکلیف کا احساس؛ ایک عجیب سی کیفیت، جیسے اپنے پر ظلم و تشدد کرنے والوں کے لیے خدا سے معافی کی درخواست کر رہی ہوں: 'اے پروردگار! یہ نادان بچے ہیں انھیں معاف کر دے تاکہ یہ دوسروں سے محبت اور پیار کرنا سیکھیں۔ ظلم کا بدلہ ظلم سے نہیں پیار سے لیا جاتا ہے۔ میں نے انھیں چاہا ہے، محبت کی ہے۔ اے عظیم باپ! میں نے تیری شمع روشن کر دی ہے۔ مجھے کوئی دکھ نہیں، کوئی غم نہیں۔ میں خوش ہوں کہ تیرا پیغام سب کو سنا سکا۔'"

مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ منی ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوش گوار سا سکون تھا۔ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اُس کی پلکوں سے ایک آنسو ڈھلک کر گود میں آ گرا۔ اُس نے آنکھیں پونچھ کر کہا:

"دنیا نے ہمیشہ سزا دی ہے۔ جس نے انھیں محبت اور نیکی کا پیغام دیا ہے کہیں اُسے صلیب پر لٹکایا ہے، کہیں اُس کے سینے میں گولیاں داغی ہیں۔ ہزاروں سال کی تہذیب و ترقی کے بعد بھی آدمی پوری طرح سے انسان نہیں بن سکا۔"

منی کی آواز میں درد تھا، آنسوؤں کی نمی تھی، ایک دُکھی دل کی پکار اور انسانیت کا خلوص تھا۔ اُس نے سامنے دیوار پر نظریں گاڑ کر پوچھا: "تم کرائسٹ کو مانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"لیکن تم تو ہندو ہو۔"

"ہندو یا مسلمان ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر میں عیسائی ہو کر جھوٹ، نفرت اور دھوکے کا پرچار کروں تو؟"

اُس نے کچھ کہا نہیں، کرائسٹ کی تصویر دیکھتی رہی۔

باہر آنٹی اور سوسن کے قدموں اور باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ سوسن سیدھی منی کے کمرے میں آگئی۔ مجھے وہاں کر قدرے حیرانی سے بولی: "تم کب آئے؟"

"دیر سے بیٹھا ہوں۔"

اُس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا، جیسے کوئی بہت ہی عجیب بات ہو گئی ہو۔ پھر آگے بڑھ کر میز پر Cadbury's Milk Chocolate کی چار بار رکھ دیں اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

میں بھی اُٹھ کر آگیا۔

سوسن اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُداس، مغموم سی۔ اس نے مجھے بلایا نہیں۔ میں خود ہی اُس کے نزدیک چلا گیا: "یہاں کھڑی ہو؟"

"یونہی۔"

یہ دونوں بہنیں کیسی لڑکیاں ہیں۔ سوسن نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ منی یہاں آگئی ہے، وہ بھی کسی دن پرس جھلاتی اس راستے پر چل دے گی۔ اس خیال سے ہی مجھے دکھ سا ہوا۔

"لڑائی نہیں ہوئی منی سے؟" سوسن نے پوچھا۔

"لڑائی؟ کیوں؟ وہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔"

سوسن میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہی مسکراہٹ جو سگی بہن کہتے ہوئے اس کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی۔ وہ جا کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

میں بھی کرسی پر اُس کے سامنے جا بیٹھا۔

اُس نے پرس کھولا اور اُس میں سے نوٹ نکالے۔ دس دس کے پانچ نوٹ تھے۔ پھر نوٹوں کو ہاتھ میں ردّی کاغذوں کی طرح پکڑ کر بولی:

"ہماری اچھائی کی قیمت!"

میری نظریں جُھک گئیں۔

وہ کہنے لگی: "منی اچھی لڑکی ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ اچھی نہ رہے۔ ایک دم بُری ہو جائے۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں اُسے زہر دے دوں۔"

میں یہ سُن کر دم بخود رہ گیا۔ سوسن کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت سنجیدہ ہو رہی تھی۔ مَیں نے بات کا رُخ بدلنا چاہا: "کسی سے لڑ کر تو نہیں آئی ہو؟"

"لڑ کر؟" وہ اس طرح ہنسی جیسے رو رہی ہو۔ "لڑنے کے بھلا کوئی عورت کو پچاس روپے دیتا ہے؟" اُس نے میری طرف دیکھ کر نوٹ ہوا میں پنکھے کی طرح ہلائے، پھر بولی: "مَیں لڑ سکتی ہوں کسی سے؟ مجھ جیسی لڑکیاں اپنے

آپ سے لڑنے کے لیے ہوتی ہیں، دوسروں سے نہیں۔" اُس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

"جب تم اُسے زہر دینے کی سوچتی ہو تو اس کے لیے چاکلیٹ کیوں لائیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں،" وہ مسکرائی، "یہ سوچنے کی بات ہے۔ اُسے بچپن سے اس کا شوق ہے۔ ممی اُس کے لیے ہمیشہ چاکلیٹ لایا کرتی تھیں —— اور زہر —— ہاں، زہر بھی تو کھانے کی چیز ہے۔"

"اس طرح مت سوچا کرو۔"

"سوچنے پر کیا آدمی کا بس چلتا ہے۔"

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ پھر وہ بولی: "ایک بات بتاؤ گے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے کبھی میرے ساتھ رات نہیں گزاری۔ نفرت کرتے ہو مجھ سے، برا سمجھتے ہو یا کوئی اور ڈر ہے —— کسی بیماری وغیرہ کا!"

"تم کیا سوچتی ہو؟"

"اشخینیں سوچا نہیں کرتیں۔"

میں اُٹھ کر اُس کے قریب چلا گیا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا: "آج بہت دکھی ہو۔"

اُس نے جواب نہیں دیا۔ میری طرف دیکھا۔ اُس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔

"تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ ایسا ہوتا تو میں یہاں آتا ہی کیوں؟ اچھا، اب تم آرام کرو۔"

وہ خاموش بیٹھی فرش کی ٹائلوں کو دیکھتی رہی۔ میں لوٹ آیا۔

منی اب مجھ سے کافی کھُل گئی تھی۔ ہمارے درمیان جیسے ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ کچھ حدیں مقرر ہو گئی تھیں۔ اب تو وہ کہیں بھی ہوتی، میرے آنے کی خبر سُن کر فوراً آجاتی اور گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ لمبی چوڑی بحث و تمحیص میں اُلجھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ کہہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی اور پھر اپنے خیالات کے سمندر میں اُتر جاتی۔ اگر وہ کبھی بحث میں اُلجھ جاتی تو بہت جلد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی۔ اُس وقت اُس کا رویہ کچھ ایسا ہوتا جیسے سب اس کے دشمن ہوں اور جان بوجھ کر اُسے شرمسار کرنے یا چڑانے کے درپے ہوں۔ بعد میں وہ اپنے دل کا غبار میرے سامنے نکالتی اور جب میں اُسے سمجھاتا کہ ایسی کوئی بات نہیں تو وہ بچوں کی طرح جھٹ مان جاتی، ہنس کر کہتی: "میں بھی پاگل ہوں، ہوں نا!"

"نہیں تو۔" میں شرارت سے مسکراتا۔

وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنستی: "تم ڈرتے ہو مجھ سے۔" پھر ایک دم سنجیدہ ہو جاتی اور کہتی: "تم سب مجھ سے ڈرتے ہو۔ تم، سوسن، آنٹی، سب —— میں کیا بھتنی ہوں؟ وسیم بھی مجھ سے ڈرتا تھا۔"

"وسیم کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وسیم، وہی جس کے باپ کے ساتھ میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔" وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے وسیم اور اس کے باپ سے ناواقف ہونا میری جہالت ہو۔ پھر کہنے لگی: "مجھے وسیم اچھا لگتا تھا۔ شرمیلا، چپ چاپ رہنے والا، بالکل

لڑکیوں سا۔ میں اس سے کہتی: 'مجھے بھگا لے چلو'، اور اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ جب میں نے یہی بات اس کے باپ سے کہی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ مجھے اس بڈھے پر ہنسی آئی۔ جب میں ٹیکسی میں اُس کے ساتھ بیٹھی تو میرا جی بار بار قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے دو چار مرتبہ مجھے ہاتھ لگانا چاہا۔ میں نے کہا: 'گھر چل کر'، وہ مان گیا۔ بیوقوف! چغد! گھر پہنچ کر اس نے مجھے نچلے کمرے میں بٹھایا۔ ولیم اوپر رہتا تھا۔ ایک چکر اوپر لگا کر وہ پینے بیٹھ گیا۔ اس نے دو پیگ پیے۔ میں چاہتی تھی وہ زیادہ پیے، اس لیے ایک بڑا پیگ بنا کر اپنے ہاتھ سے پلایا۔ پھر میں نے ایک بڑا پیگ اور بنایا۔ وہ ضد کرنے لگا کہ میں اس کی گود میں بیٹھ کر پلاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ بہکنے لگا۔ میں نے ایک اور پلا دیا۔ وہ بے سُدھ ہو کر پڑا رہا۔ میں چپکے سے اُٹھی۔ باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا اور اوپر ولیم کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس سمے پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، رنگ پیلا پڑ گیا۔

"'اس وقت ——— اس وقت کیسے آ گئیں؟'

"'تمھارے ڈیڈی لائے تھے۔'

"وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جب میں نے اُسے ساری کہانی سُنائی تو وہ ڈر سے کانپنے لگا۔ میں ہنسنے لگی۔ بولا: 'ہنسو نہیں، ڈیڈی ماریں گے۔' میں نے اس کے ڈیڈی کو موٹی موٹی گالیاں دیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر میں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھا کہ جا کر ڈیڈی کے کمرے کا دروازہ کھول آئے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے چانٹا لگایا۔ پھر وہ نہیں اٹھا اور ساری رات جاگتا رہا۔ میں اطمینان سے سوتی رہی۔ بڑا ڈرپوک تھا وہ۔ صبح میں گھر آ گئی۔"

میں حیران منی کو دیکھتا رہ گیا۔

ایک شام اس نے مجھ سے بڑا عجیب سا سوال کیا۔ پوچھنے لگی: "تمھیں کسی لڑکی سے محبت ہے؟"

میں جواب کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پھر بولی: "میرے بھائی نے ایک لڑکی کے لیے جان دے دی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے یونہی پوچھ لیا، حالانکہ یہ کوئی پوچھنے کی بات نہ تھی۔

"بیوقوف، وہ کیا مجھے بتا کر گیا تھا مرنے؟"

اس روز ہم باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آسمان پر پنچمی کا زرد سا چاند کسی بیمار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ستاروں بھرا نیلا آسمان جیسے درختوں پر جھک آیا تھا۔ سرد اندھیرا درختوں میں کسی بیوہ کی طرح اداس اداس سا بھٹک رہا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ ایک جھکی ہوئی ٹہنی کو تھام کر وہ چلتی چلتی ایک دم رُک گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی: "میں کیسی لڑکی ہوں؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اتنا سیدھا اور سادہ ہوتے ہوئے بھی سوال بیحد ٹیڑھا اور پیچیدہ تھا۔ میں نے سوچا منی کو اُس کے سوال سمیت چھوڑ کر چلا جاؤں اور سوسن کے ہاتھ سے ایک پیگ پی کر آنٹی سے پیانو سنوں۔ لیکن میں ایسا کر نہیں سکا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"

میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا: "اچھی لگتی ہو۔"

وہ مسکرا دی: "بس!"

میں بیوقوفوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔

اس نے جھٹکے سے شاخ چھوڑ دی۔ چند سیکنڈ تک شاخ جھولتی رہی اور رات کی خاموشی میں پتّوں کی سرسراہٹ سُنائی دیتی رہی۔ پھر وہ بولی:

"اچھی کیسے ہو سکتی ہوں۔ یہاں رہتی ہوں، اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی تم سے چھپا نہیں —— میں. . ."

وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"جانتا ہوں۔"

وہ آگے بڑھ کر ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

مَیں بھی اُس کے ساتھ جا بیٹھا۔ ہمارے چاروں طرف خاموش سرد اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اوپر درختوں کی شاخیں اس طرح ایک دوسری میں الجھی ہوئی تھیں کہ پتّوں کی چھت سی بن گئی تھی اور اُس کنج میں اندھیرا اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پتّوں میں سے مَیں صرف ایک ستارہ دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی تنہائی عجیب سا درد پیدا کر رہی تھی۔ ہمارے پیچھے فوّارہ تھا جو اُس سمے بند تھا۔ وہاں سے آنٹی اور سوسن کے کمروں کی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ سوسن کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور باغ میں گھاس پر روشنی کی مستطیل سی بن گئی تھی۔ آنٹی کے کمرے سے پیانو کی مدھم اور سریلی آواز آ رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی رات کو پیانو بجایا کرتی تھیں۔ اُس سمے وہ نہ جانے کون سی دھن بجا رہی تھیں۔ مَیں مغربی موسیقی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بیتھوون وغیرہ کے نام ضرور سُن رکھے ہیں۔ موسیقی کا تعلق جہاں تک محسوسات اور جذبات سے ہے، دل اور روح کی گہرائیوں سے ہے، وہ محسوس کر سکتا ہوں۔ اور اُس سمے —— جب چاروں طرف رات کی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور چاند بہت دور چلا گیا تھا اور ستاروں بھرا نیلا آسمان درختوں پر جھک آیا تھا اور ایک ستارہ تنہا تنہا پتّوں کی چھت سے جھانک رہا تھا —— وہ نغمہ میری روح کی گہرائیوں میں کچھ کریدنے لگا تھا اور میں آنٹی کے کمرے کی کھڑکی پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

نہ جانے کب منی میرے شانے سے آ لگی تھی۔ میرا بازو آپ سے آپ اس کے گرد پھیل گیا تھا، جیسے وہ روح کی تنہائی، وہ ٹیس اس ایک پل میں ہم دونوں نے ایک ساتھ محسوس کی ہو۔ وہ اور بھی مجھ سے لگ گئی۔ اچانک مَیں نے محسوس کیا کہ منی نے سسکی لی ہے۔ میں نے اُس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھا۔ وہ واقعی رو رہی تھی۔ مُندی ہوئی پلکوں سے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔ مجھے لگا آسمان سے ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ شاید یہ اُس نغمے کا اثر ہو، میرا اپنا جی بار بار رونے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے بازو کا حلقہ تنگ کر دیا اور رومال سے اُس کے آنسو پونچھ دیے۔

اس نے پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور آنسوؤں کے بیچ مسکرا دی۔ عجیب سا سماں تھا وہ۔ زیادہ سے زیادہ ساون کے کسی ایسے دن سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جب ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو اور ساتھ ہی دھوپ بھی چمک رہی ہو۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے بھی بات بنے گی نہیں۔ الفاظ کی گرفت میں وہ سب کچھ نہیں آ سکتا جو دل کہنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کتنی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔

پیانو کی آواز ڈوبتی ڈوبتی بالکل ڈوب گئی اور رات کے سرد سنّاٹے میں ایک کسک، ایک درد چھوڑ گئی۔

منی میری گود میں سر رکھے گھاس پر لیٹ گئی تھی اور پتوں کی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مَیں اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''آنٹی جب بہت دُکھی ہوتی ہیں تو یہ دُھن بجاتی ہیں۔'' منی بولی۔

''تم رونے کیوں لگی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مَیں پاگل جو ہوں۔ میری جیسی لڑکی کو رونا نہیں چاہیے۔ ہے نا!'' وہ مُسکرا دی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی مُسکراہٹ میں اُس کے دل کے زخموں کی ٹیس اور روح کا غم چُھپا ہو۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن اُس کا شعور ہے۔ مَیں نے اُس سے کہنا چاہا لیکن ہمّت نہ ہوئی۔

آنٹی کے کمرے کی بتّی گُل ہو گئی۔ چند منٹ بعد سوسن کے کمرے کی بتّی بھی بُجھ گئی۔ باغ کا اندھیرا ایک دم بہت گہرا لگنے لگا۔ خاموشی اور بھی بڑھ گئی، جیسے سب کچھ سنّاٹے کے مہاساگر میں ڈوب گیا ہو۔ منی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چھاتی پر دبا لیا، جہاں میں اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کر سکتا تھا۔

''سوسن دعا ختم کر چکی ہے۔'' منی بولی۔

''کیا روز دعا کر کے سوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ورنہ وہ سو نہیں سکتی۔'' وہ بولی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی۔ پھر کہنے لگی: ''کیا اس طرح انسان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟'' وہ پھر اپنے خیالات میں اُتر گئی۔ چند سیکنڈ چُپ رہ کر بولی: ''کیا سوسن گناہ کر رہی ہے؟ میں اکیلی بیٹھی یہی سوچا کرتی ہوں: گناہ کیا ہے؟ ثواب کیا ہے؟ ہر مذہب نے اس پر بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن جس زمانے میں مذہب تھے ہی نہیں، صرف انسان تھا اور اُس کی ضروریاتِ زندگی تھیں، تب؟ اور اب گناہ کون کر رہا ہے؟ کسے اس کی سزا ملتی ہے؟ مزدور مزدوری لیتا ہے، گناہ نہیں؛ کلرک تنخواہ لیتا ہے، گناہ نہیں؛ ڈاکٹر فیس لیتا ہے، گناہ نہیں؛ سوسن اگر کسی مرد کے ساتھ رات گزار کر پیسے لیتی ہے تو گناہ کیسے ہو گیا؟ مان لیا سوسن نے گناہ کیا، لیکن اُس مرد نے! وہ ہنستا گاتا آتا ہے، شراب پیتا ہے، جُوا کھیلتا ہے، رات گزارتا ہے اور اپنی موٹر میں چلا جاتا ہے۔ مان لیا جائے وہ بھی گناہ کرتا ہے۔ لیکن جب مذہب نہیں تھا، گناہ کا یہ تصوّر نہیں تھا، رشتہ صرف عورت اور مرد کا تھا، تب؟ فعل تو آج بھی وہی ہے، بیچ میں مذہب کے آ جانے سے گناہ کیوں کر ہو گیا؟ پھر ہم خدا سے معافی کیوں مانگتے ہیں؟ خدا جب ایک آدمی کو اتنا دیتا ہے کہ وہ دولت اور طاقت سے سوسن اور اُس جیسی لڑکیوں کو حاصل کر سکتا ہے تو اس میں سوسن کا کیا قصور ہے؟ قصور تو اس خدا کا ہے۔ لیکن خدا کو قصوروار ٹھیرانا بھی تو ایک گناہ ہے ——— اور یہ تصوّر شاید ہم لوگوں کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ میں بہت سوچتی ہوں لیکن کچھ سمجھ نہیں پاتی۔ تم کہانیاں لکھتے ہو، تم شاید سمجھ سکو ——— بولو ——— سمجھا سکتے ہو؟''

میں کچھ کہہ نہیں سکا۔ کیا کہتا؟ کیا سمجھاتا؟ خود وہ کیا نہیں جانتی؟ اتنی ذہین، اتنی عقلمند لڑکی کیا اس دُنیا میں سُکھی رہ سکتی ہے؟ میں یہی سوچنے لگا تھا۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ سمجھ دار تھی۔

وہ آپ ہی کہنے لگی: ''میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ اچھی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وقفے کے بعد وہ کہنے لگی: ''اور میں بُری بھی کیسے ہوئی۔ صرف اس لیے کہ میں اپنا جسم بیچتی ہوں۔ لیکن اُس وقت وہاں میرا جسم ہوتا ہے، میں نہیں ہوتی۔ سمجھ رہے ہو میری بات! تو کیا میں پاک نہیں ہوئی؟ ناگپور میں مَیں نے یہ سوال ایک فادر سے کیا تھا: ''اگر نیک مریم پاک

ہو سکتی ہے تو سوسن کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتا ہے کل سوسن کے پیٹ سے کوئی کرائسٹ پیدا ہو، پھر تم اس کا بھی احترام کرنے لگو گے، اسے پوجنے لگو گے، آج کیوں نہیں کرتے؟ جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا؟" اُس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور خود ہی بولی: "اُس نے میرے سینے پر کراس بنا دیا۔ اُس دن کے بعد میں کبھی چرچ نہیں گئی۔"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم بور ہو رہے ہو گے۔ چلو۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

جب میں اُسے کمرے میں پہنچا کر لوٹنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو: "مت جاؤ آج۔" میں نے اُسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ وہ جیسے میرے سینے پر گرنے کو ہو رہی تھی۔ اُس کے لب پھڑک رہے تھے اور آنکھوں میں نشہ سا آچلا تھا۔ میں آہستہ سے اُس پر جھک گیا، وہ پاؤں پر اُٹھ آئی، اور پیشانی آگے کر دی۔ میں نے لب اُس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ اُس وقت میرے ہونٹ اور اُس کی پیشانی برف ہو گئے تھے۔

وہ بولی: "ناراض تو نہیں ہو گئے؟"

"ناراض کیوں ہوتا۔" میں نے کہا اور مسکرا کر باہر آگیا۔

جب اُس نے میرا ہاتھ تھاما تھا تو اس کے دل میں کچھ اور تھا، اور جب میں اُس پر جھکا تو اُس نے فوراً ارادہ بدل دیا اور لبوں کی بجائے پیشانی آگے کر دی۔ کیوں؟ اسی ادھیڑبن میں میں گھر پہنچ گیا۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں عموماً منی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ کیسی لڑکی ہے؟ اور میرے سامنے ایک ٹیڑھی سی لکیر کھنچ جاتی۔ لیکن اس کی باتیں ہمیشہ سیدھی اور صاف ہوتیں۔ وہ کچھ چھپانے کی عادی نہیں تھی۔ اس نے مجھے ایک دن یہ بھی بتا دیا کہ پچھلی رات وہ ایک سکھ کے ساتھ سوئی تھی۔ رات کو اُس نے قینچی سے اُس کے کیس، داڑھی اور مونچھیں کتر دیں۔ صبح اُٹھ کر جب اُسے معلوم ہوا تو وہ گالیاں بکنے لگا اور وہ اُسے دیکھ کر ہنستی رہی۔

وہ کہنے لگا: "یہ میرے مذہب کی توہین ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور کسی غیر لڑکی کے ساتھ سونا کون سے گرو نے جائز قرار دیا ہے؟" منی نے پوچھا۔

ایسے ایسے کئی واقعات تھے۔ آنٹی اُس سے تنگ آ چکی تھیں، اُسے کئی مرتبہ مار بھی چکی تھیں، لیکن وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز وہ مجھے ریلوے اسٹیشن پر مل گئی۔ وہ پلیٹ فارم پر اکیلی ٹہل رہی تھی۔ میں اُس کے قریب چلا گیا۔ اُس کا لہجہ بہکا بہکا اور باتوں میں بے تکا پن تھا۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ہاتھ بے قابو ہو رہے تھے۔ ہر بات کو وہ ہاتھوں کے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کرتی اور بات بے بات ہنستی جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ نشے میں ہے۔

"کیا حال ہے؟" اس نے انگریزی میں پوچھا۔

اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا، ایک ٹی ٹی مڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بھڑک اُٹھی: "بی آف یو ڈیو۔"

میں نے اُسے بازو سے سنبھالا اور گیٹ کی طرف لے چلا۔ لوگ مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ کچھ اشارے کر کے ہنس رہے تھے۔ مجھے پسینہ سا آنے لگا۔ وہ اڑ گئی۔

"پہلے ان لوگوں کو نمائش دکھالوں۔ باسٹرڈز، سوائنز، فلدی ریس۔"

میں اُسے وہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ لوگ جمع ہونے لگے تھے اور پولیس کی مداخلت اس کے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ بھیڑ میں کچھ میرے دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے۔

"تم مجھے اس طرح کیوں کھینچ رہے ہو۔" وہ مجھ پر برس پڑی، "میں تمھاری بیوی یا داشتہ نہیں ہوں" وہ انگریزی بولنے لگی۔

بھیڑ میں قہقہہ گونجا۔

میں نے اُسے جھٹکے سے کھینچا اور باہر لے جاکر کار میں پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

کچھ دور جاکر میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہ بوتل منہ سے لگائے شراب پی رہی تھی۔ میں نے کار روک لی اور ہاتھ بڑھاکر بوتل اُس سے چھین لی۔ وہ مجھ پر جھپٹی اور مجھے بالوں سے پکڑ لیا۔ وہ وحشی ہو رہی تھی۔ اُسے علیحدہ کرنے کے لیے میں نے پورے زور سے اس کے گال پر تھپڑ مارا اور پیچھے دھکیل دیا۔ وہ سیٹ پر جاگری۔

"اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مار مار کر ہڈیاں توڑ دوں گا۔ سمجھیں۔" میرا ارادہ اسے مارنے کا قطعی نہیں تھا۔ صرف ڈرانے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ مجھے اطمینان سے ڈرائیو کرنے دے۔

وہ سیٹ کے کونے میں منہ دیے سسکیاں بھرتی رہی۔ کچھ دیر میں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر کار اسٹارٹ کردی۔

وہ سسکیوں کے درمیان بڑبڑانے لگی۔

"میں اپنی مرضی سے رہوں گی۔ کسی کو کیا حق ہے مجھے کچھ کرنے پر مجبور کرنے کا۔ میں کوئی پراس Pros نہیں ہوں۔ جس کے ساتھ جی چاہے گا جاؤں گی، نہیں چاہے گا نہیں جاؤں گی۔ ماریں مجھے، جان سے ماردیں، کبھی نہیں جاؤں گی۔ آنٹی نے کیوں مارا مجھے؟ کیوں مارا؟"

میں بہت حد تک معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا اسے کیوں مارا۔ وہ تو پہلے ہی دُکھی تھی۔ ٹھیک تو ہے۔ اُسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔ لیکن میں اُسے کیا کہہ کر سمجھاتا۔ میں ڈرائیو نہیں کرسکا۔ کار روک کر پچھلی سیٹ پر گیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے اس کا بازو تھام کر چہرہ اپنی طرف کیا۔

"اور ماروگے؟ مارلو، تم بھی مارلو، سب مارو مجھے۔"

"منی، تم تو شراب نہیں پیا کرتیں۔"

"اب پیتی ہوں، اور پیوں گی۔ تمھیں کیا؟"

"اس طرح پلیٹ فارم پر۔"

"جہاں جی میں آئے گا پیوں گی۔"

مجھے نہ جانے کیوں ایک دم غصہ آگیا۔ میں نے آواز دباکر لیکن ذرا سختی سے کہا: "پھر لگاؤں گا چانٹا۔"

اُس نے گال آگے کردیا۔

میری انگلیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ میں نے ہولے سے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا: "تم تو اتنی سمجھدار ہو!"

اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ میں اُس کی پیٹھ اور بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہولے ہولے اس کی سسکیاں دب گئیں۔ اُسے سیٹ پر لٹا کر میں پھر ڈرائیو کرنے لگا۔

جب میں آنٹی کی کوٹھی میں داخل ہوا تو وہ اور سوسن حیران و پریشان سی باہر برآمدے میں کھڑی تھیں۔ میں انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ انھوں نے رسماً سلام کیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میں اُن کی پریشانی کی وجہ سمجھ رہا تھا اس لیے ہنس کر بولا:

"منی میرے ساتھ ہے۔"

سوسن بھاگ کر کار کی طرف آئی اور دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

مَیں اُتر کر آنٹی کے پاس چلا گیا۔ اُس وقت وہ بےحد غصّے میں تھیں۔

مَیں انھیں بازو سے تھام کر اندر لے گیا۔

جب سوسن منی کو سنبھالے برآمدے میں سے گزری تو آنٹی تیزی سے اُٹھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ غصے میں ہیں اور منی نشے میں۔ بات بڑھ سکتی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"منی میرے ساتھ تھی۔"

آنٹی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں: "جھوٹ —— سراسر جھوٹ۔"

"آپ بیٹھیے، میں بتاتا ہوں سب کچھ۔"

وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔

"میں ادھر ہی آرہا تھا۔" میں نے کہا، "منی مجھے راستے میں مل گئی۔ میں اُسے ساتھ لے گیا۔ وہ کچھ اُداس تھی۔"

"میں پوچھتی ہوں وہ گھر سے اس طرح نکلی کیوں؟ کیا سمجھتی ہے وہ خود کو؟ میں آج اس کا فیصلہ کر کے ہی رہوں گی۔ جانتے ہو اس نے کیا کیا ہے؟ وہ جب یہاں میرے پاس آئی ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کیا ہوتا ہے، یہاں لوگ کیوں آتے ہیں؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ میرا گھر کوئی مندر بھی نہیں۔ سوسن اس کی بہن ہے، وہ بھی تو رہ رہی ہے۔ منی کو میرا حکم ماننا ہوگا۔"

"ابھی وہ بچّی ہے،" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا، "دھیرے دھیرے سب سمجھ جائے گی۔"

"اس گھر میں میری مرضی چلے گی، میرا حکم چلے گا۔ اس نے مجھے سب کے سامنے بےعزت کر دیا۔ میں یہ بدتمیزی اور گستاخی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس روز اس نے ایک آدمی کو شراب میں خواب آور گولیاں دے کر رات کو اس کے بال کاٹ دیے۔ اگر وہ مر جاتا تو؟ میں جس آدمی کے ساتھ کہوں گی اُسے جانا ہوگا۔"

"لیکن آنٹی!"

"مَیں جانتی ہوں تم کیا کہو گے۔" وہ بولیں، "تم لوگ کہانیوں کی دُنیا میں رہتے ہو، حقیقی زندگی کچھ اور ہے۔ مَیں جانتی ہوں میرا پیشہ کیا ہے، اس کی کیا کیا مشکلات ہیں اور انھیں کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔ ہمیں پیسے سے غرض ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ فلاں کے ساتھ جائے گی، فلاں کے ساتھ نہیں۔ اگر یہ اصول بنا بھی لیا جائے تو موقعے کی نزاکت کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے۔ جس کے بال اس نے کاٹے ہیں وہ پولیس افسر ہے۔ وہ ہمارے

لیے مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔ پولیس والوں سے دشمنی کر کے ہم لوگ چین سے نہیں رہ سکتے۔ ہم کیا کوئی بھی شریف آدمی نہیں رہ سکتا۔ تم کیا وثوق سے کہہ سکتے ہو گھر جاتے ہوئے تمھاری جیب سے ناجائز چرس، افیم، سونا یا کوکین برآمد نہیں ہوگی؟ میں کہتی ہوں ہو سکتی ہے۔ تجربے کی بنا پر کہتی ہوں، اور ایسا ہو رہا ہے۔ اور گھر پہنچنے کی بجائے تم جیل پہنچ جاؤ گے، جہاں وہ افسر ہاتھ پر رول بجا کر، مونچھوں میں مسکراتا تمھارے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوگا اور تم ہاتھ باندھے اُس کے سامنے کھڑے ہوگے۔ وہ تم سے پوچھے گا: "کیوں مسٹر یہ دھندا کب سے شروع کر دیا؟" اور تم اُس کی طنز بھری زہریلی مسکراہٹ اور بناوٹی لہجے کی تاب نہیں لا سکو گے۔ کچھ کہنا چاہو گے تو کہہ نہیں پاؤ گے۔ جلی ہوئی رسی کی طرح بل کھا کر رہ جاؤ گے اور وہ تمھاری ماں بہن کو گالیاں دے کر سپاہی سے کہے گا کہ اسے جیل میں بند کر دو۔ سپاہی تمھیں کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا شرابیوں، جواریوں، غنڈوں اور عادی مجرموں کے ساتھ بند کر دے گا۔ رہ سکو گے تم وہاں؟ بولو؟ یہ تو مرد کے ساتھ ہوا ——— اور اگر عورت ان کے ہاتھ آ جائے تو صحیح حالت میں واپس نہیں آتی کبھی۔"

میں مبہوت سا آنٹی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے ایک تلخ حقیقت بیان کر دی تھی۔ یہاں کس وقت، کس کی عزت خاک میں مل جائے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے منی سے نفرت ہے۔ کیوں ہوگی نفرت! میں اُسے پیار کرتی ہوں۔ مجھے اُس کا فکر رہتا ہے۔ لیکن کسی قسم کی مصیبت یا جھگڑے میں بھی نہیں پڑنا چاہتی۔" وہ خاموش ہو گئیں۔ پھر کہنے لگیں: "منی کیا چاہتی ہے ——— جس طرح اُس کی مرضی ہو رہے ——— نہیں اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ دُنیا اُسے قدم قدم پر جھنجھوڑے گی۔ اس دُنیا میں سپنوں کے سہارے زندہ رہنے والا ہمیشہ دُکھی ہوتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کوئی اُس سے زبردست محبت کرے گا اور پھر اس سے شادی کر لے گا۔ لیکن اب یہ ناممکن ہے۔ مرد کچھ اور چاہے یا نہ چاہے اپنی بیوی کا ماضی چاندنی کی طرح اُجلا اور بے داغ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہی عورت کو ناپاک کرنے والا ہے۔ وہ نہیں سوچتا عورت بیچاری کا کیا ہوگا۔ وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ جوانی میں وہ سوچتی ہے کہ مرد کو بیوقوف بنا رہی ہے، اور جب بڑھاپا اُس کے دروازے پر آ کر دستک دیتا ہے تو اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوتا ہے کہ وہ خود بیوقوف بنتی رہی ہے۔ عورت زندگی کی ایک لازمی کڑی ہے، آسمانی تحفہ ہے اور نہ جانے کیا کیا کہی گئی ہے، لیکن ——— دراصل وہ ازل سے ابد تک ایک ٹریجڈی ہے۔ سب مجھے مس ہنس کہتے ہیں۔ یہ لفظ "مس"، مجھے اپنے نام کے ساتھ ایک ننگا قہقہہ معلوم ہوتا ہے جو ہر گھڑی میرا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔ پھر اس راستے پر چل کر منی کیا سوچتی ہے۔ سپنوں کا زخم بہت گہرا اور انمٹ ہوتا ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں چاہتی ہوں وہ اپنی حقیقت پہچان لے۔"

آنٹی ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اُن کے دل کا غبار جیسے نکل گیا۔ آج میں نے پہلی مرتبہ انھیں اس طرح جوش و جذبات کی رَو میں بہتے دیکھا تھا۔ عموماً وہ خاموش رہتی تھیں۔ مطلب کی بات کرتیں۔ میں ایک دم کچھ نہیں کہہ سکا۔ پھر بولا:
"آنٹی! منی کو نرمی اور پیار کی ضرورت ہے۔"

"تم دے سکتے ہو اُسے یہ چیز؟" انھوں نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ وہ نظریں مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں کریدتی محسوس ہو رہی تھی۔ "جانتے ہو عورت مرد کی ہمدردی نہیں چاہتی، خالی خولی وقتی پیار و محبت کی میٹھی میٹھی باتیں بھی نہیں۔ وہ برگد کی چھاؤں دینے والی، ہمیشہ ہری رہنے والی محبت کی خواہاں ہوتی ہے۔ منی بھی ایک عورت ہی ہے۔ دے سکتے ہو اسے ایسی محبت؟ وہ تمھیں زندگی بھر خوش رکھے گی۔ جاؤ، لے جاؤ اُسے۔"

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں انجنا کی تصویر اُبھر آئی، جس کے والدین میرے والدین سے مل کر

ہماری شادی طے کرنے کی فکر میں تھے۔ میں نے دل میں ایک عجیب سی چبھن محسوس کی۔ میں اپنے آپ کو ننگا دیکھ رہا تھا۔ عجیب سا احساس تھا۔ جیسے میری ننگی نعش کسی نے گڑھے سے نکال کر میرے سامنے ڈال دی ہو ——— اور میں اس پر ماتم بھی نہ کر پا رہا ہوں۔

نہ جانے کب آنٹی نے پیگ بنا کر میرے سامنے کر دیا۔ مجھے تب ہوش آیا جب میری ناک نے گلاس کی ٹھنڈک اور وہسکی کی تیزی محسوس کی۔

"لو پی لو۔"

میں نے گلاس تھام لیا اور آنٹی پیانو پر جا بیٹھیں۔ وہ دھیرے دھیرے "کی بورڈ" پر ہاتھ چلانے لگیں۔ کوئی گیت نہیں تھا۔ یونہی ایک دھن تھی، جس میں عجیب سا درد بھرا تھا، جو تنہائی اور غم کے احساس کو ہولے ہولے شدید بنا رہا تھا۔ میرا جی زیادہ سے زیادہ پینے کو کرنے لگا۔ آنٹی پیانو بجاتی رہیں۔ انھوں نے پلٹ کر ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میں پیتا رہا۔ میرا جی اُس وقت پی پی کر مر جانے کو ہو رہا تھا۔ میں چھٹا پیگ ختم کر کے ساتواں بنانے کے لیے اُٹھا تو میز سے ٹکرا کر قالین پر لڑھک گیا۔ بس اتنا ہی یاد ہے۔ پھر جب تھوڑا سا ہوش آیا تو میں بستر پر پڑا تھا اور آنٹی مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ وہ میری ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں موندیں تو ذہن کے اندر بھنور سے پیدا ہونے لگے۔ سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ آنٹی کا چوڑا چہرہ دھندلا گیا تھا اور مجھے آنکھیں کھولنے میں زور لگانا پڑ رہا تھا۔

"اتنی کیوں پی تھی؟" آنٹی نے میری پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

میں کہنا چاہتا تھا: "تم وہ دُھن کیوں بجا رہی تھیں؟" لیکن کہہ نہیں سکا، اور آنٹی میرا ماتھا چوم کر چلی گئی تھیں۔

صبح تین چار کا وقت ہو گا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ منی کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری چھاتی پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ میں نے رات کے معاملے پر غور کیا تو سب کچھ یاد آنے لگا۔ ذہن ایک حد تک صاف ہو چکا تھا۔ رات پینے کے بعد کی اُس تصویر میں منی کا چہرہ کہیں نہیں تھا۔ پھر اُس وقت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ملائم بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

وہ ایک دم جاگ گئی اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اُس مسکراہٹ میں کیا تھا ——— معصومیت، محبت، خود سپردگی اور قربان ہونے کا جذبہ ——— میں ٹھیک سے بیان نہیں کر سکتا۔ شاید وہ سوئی نہیں تھی، بیٹھے بیٹھے اُونگھ گئی تھی۔ اُس نے تھکن بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ نہ جانے وہ خمار تھا یا صبح کاذب کا جادو کہ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا اور آہستہ سے اُس کے لب اپنے لبوں کے نزدیک لے آیا۔ اُس کی آنکھوں میں، اس کے انگ انگ میں اُس سمے مکمل خود سپردگی کا نشہ تھا۔ اُس کی باہیں مجھ سے لپٹ جانے کو بے قرار ہو رہی تھیں۔ پھر اُس نے نشے کی سی حالت میں پلکوں کی جھالریں آنکھوں پر ڈال لیں۔ نہ جانے ایک دم مجھے کیا ہوا، جیسے اندر کچھ ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ میں نے جلدی سے ہونٹ اُس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور بغیر میری طرف دیکھے یا کچھ کہے باہر نکل گئی۔

میں پل بھر تو بستر پر پڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر اُٹھ کر اُس کے پیچھے باہر گیا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس ستون سے لگی کھڑی تھی۔ ابھی چاروں طرف اندھیرا تھا، بھیگا بھیگا سا۔ درختوں پر کہیں کہیں کوئی پرندہ چہچہانے لگا تھا اور ہواؤں میں لطیف سی خوشبو اور ٹھنڈک تھی جو باہر کھلے میدان میں سیر کی دعوت دے رہی تھی۔ میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ الگ کر دیا اور بغیر میری طرف دیکھے دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں

ستون سے لگا کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئی تو میں بھی اُدھر چلا گیا۔

وہ بستر پر لیٹی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

مَیں اُس کے پلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"ناراض ہوگئیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

"چلی کیوں آئیں اس طرح؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"میری مرضی۔" اُس نے تیزی اور تیکھے پن سے کہا۔ پھر پل بھر چُپ رہ کر بولی: "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم رات بھر میرے پاس کیوں بیٹھی رہی تھیں؟"

"تم مجھے اسٹیشن سے نشے کی حالت میں سنبھال کر گھر لائے تھے، سوچا وہ بدلہ چکا دوں۔"

"بس!" میں شرارت سے مُسکرا دیا۔

اُس نے اس مرتبہ پیشانی پر تیوریاں ڈال کر میری طرف دیکھا اور بولی:

"تم کیا سمجھتے ہو میں تم سے عشق کرنے لگی ہوں؟ میں کوئی لیلیٰ یا جولیٹ نہیں ہوں، سمجھے!"

"سمجھ گیا۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔

"تو جاؤ پھر یہاں سے، کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" وہ بھڑک اُٹھی۔

"نہ جاؤں تو؟" میں ڈھٹائی سے مسکرایا۔

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا: "بھیجوں تمھیں۔" وہ بولی اور اُٹھ کر ایک زناٹے کا تھپڑ میری گال پر رسید کر دیا۔ مَیں ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اُس نے ایک اور تھپڑ لگایا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر بستر پر گرا لیا اور ہاتھوں، ٹکوں اور ناخنوں سے کام لینے لگی۔۔ نہ جانے میں نے کیوں مدافعت نہیں کی۔ وہ مارنے کے ساتھ ساتھ چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیے جا رہی تھی۔ پھر نہ جانے ایک دم اُسے کیا ہوا کہ میرے سینے پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

ایک دم کسی نے کھینچ کر اُسے مجھ سے الگ کر دیا۔ مَیں نے دیکھا آنٹی اُسے بالوں سے پکڑے کھڑی تھیں اور سوسن خوف زدہ سی میرے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ آنٹی نے زور سے منی کے گال پر چانٹا لگایا۔ پھر اوپر تلے چار پانچ دوہتڑ اور مُکے جڑ دیے اور گھسیٹ کر کرسی پر ڈال دیا۔

منی کرسی پر گر کر سسکیاں لینے لگی۔

"سب میرے دشمن ہیں۔ سب نفرت کرتے ہیں مجھ سے۔ مار ڈالو، مجھے مار ڈالو۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

آنٹی بپھری شیرنی کی طرح اُس پر جھپٹیں اور پھر مارنے لگیں۔

"پلیز،" سوسن نے میرا ہاتھ دبا کر کہا، "آنٹی کو سمجھائیے، وہ اُسے مار ڈالیں گی۔ وہ ابھی چھوٹی ہے، اُسے کچھ معلوم نہیں۔ پلیز، روکیے آنٹی کو، غصے میں اُنھیں کچھ نہیں سوجھتا۔"

میں نے سوسن کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں، رنگ فق ہو رہا تھا اور وہ سہمی سہمی سی، مدد کے لیے، میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں التجا تھی، غم تھا۔

مَیں نے لپک کر آنٹی کو پکڑا۔

"جانے دیجیے اب، قصور میرا تھا۔"

"ہٹو تم۔" وہ بولیں، " She has gone mad! میں اسے ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے اپنے آپ کو۔"

انھوں نے مجھے دھکیل کر پھر منی کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"مارو، خوب مارو۔" منی چیخے جا رہی تھی۔

مَیں نے آنٹی کو پکڑ کر الگ کیا اور اُنھیں دھکیلتا ہوا اُن کے کمرے میں لے گیا۔

"آپ وہاں کیوں آئی تھیں۔"

"وہ تمھیں جان سے مار دیتی۔ تم اُسے نہیں جانتے۔"

میں آنٹی کو کیسے سمجھاتا کہ وہ رات بھر میرے سینے پر سر رکھ کر پڑی رہی ہے اور اب قصور میرا تھا اور اس وقت بھی وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہتھیار ڈال چکی تھی۔

"میں اس لڑکی سے تنگ آچکی ہوں۔" آنٹی غصے میں بولیں۔

"آپ بھول جائیے کہ وہ یہاں ہے بھی۔"

وہ خاموش رہیں۔

ہاتھ منہ دھو کر جب میں جانے کے لیئے نکلا تو منی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن نظروں نے میرے پاؤں میں زنجیر سی ڈال دی۔ میں اُس کی طرف چلا گیا۔

"گڈ مارننگ۔" میں نے کہا۔

اس نے نظریں جھکا لیں اور پیچھے ہٹ گئی۔

میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ میز پر ناشتے کے ساتھ دو پیالیاں رکھی تھیں۔ میں بغیر کچھ کہے کمرے میں چلا گیا۔

وہ خاموشی سے پیالیوں میں کافی اُنڈیلنے لگی۔ پھر اُس نے توش پر جام لگا کر مجھے دیا۔ میرے لیے انڈہ چھیلا۔ اپنے لیے توش پر شہد لگا کر وہ بولی: "میں بے وقوف، بے سمجھ لڑکی ہوں، معاف کر دینا مجھے۔"

میں نے چاہا اُس کا ہاتھ تھام کر ہاتھ اُسے سینے سے لگا لوں، لیکن صرف میز پر رکھے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔

"ایسی بات نہ کہو۔"

"نہ جانے کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ کر دو گے نا معاف!"

"تم آنٹی کو ناراض مت کیا کرو۔" میں نے بات بدلنے کی غرض سے کہا، "وہ تمھیں بے حد چاہتی ہیں، بہت پیار کرتی ہیں۔"

وہ اس طرح ہنسی جیسے دل کا درد چھپا رہی ہو۔

"ہاں، سبھی مجھے پیار کرتے ہیں، چاہتے ہیں۔" پھر بولی، "ایک بات بتاؤ۔ جہاں آنٹی کہتی ہیں چلی جاؤں؟ بولو۔ جو تم کہو گے میں کروں گی۔"

میں حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے بڑے نازک مقام پر پہنچا دیا تھا۔ تو کیا میں اُسے اپنا آپ ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دینے کے لیے کہوں جسے وہ قطعی پسند نہیں کرتی۔ میرا کیا رول ہوگا۔ دلال کا! میری روح سے کیا کبھی یہ زخم مٹ سکے گا؟
"کیا کہتے ہو؟"
"میں آنٹی سے بات کروں گا۔" میں نے گول مول سی بات کی۔
وہ ہنسی: "میں بچی نہیں ہوں۔ مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں جانتی ہوں میرے لیے اب کون سا راستہ کھلا ہے۔ میں نے کچھ اور سوچا تھا، خیر!"
مجھے اپنے آپ میں شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں اٹھ کر آنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ٹھیرو!"
وہ جا کر ویزلین کی شیشی اٹھا لائی اور انگلی سے میرے چہرے کی خراشوں پر لگانے لگی۔ میں اُسے منع نہیں کر سکا۔ جب میں دروازے کی طرف چلا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔
اُسی روز شام کو انجنا کے والدین، چچا اور چچی ہمارے ہاں آئے۔ ہم سب ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ نوکر نے آکر کہا:
"چھوٹے صاحب، آپ سے کوئی لڑکی ملنا چاہتی ہے۔"
سب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں ابھی کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ منی گھبرائی ہوئی سی وہیں آگئی۔ وہ سیدھی میری طرف آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"
میں نے اُسے دیکھ کر چور نظروں سے انجنا کے والدین کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ حیرانی سے ہماری طرف دیکھے جا رہے تھے۔
"معاف کیجیے گا، میں آپ کی باتوں میں مخل ہوئی۔" منی نے انگریزی میں کہا۔ پھر میرا ہاتھ کھینچ کر بولی، "ذرا ادھر آؤ۔"
وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، جیسے بھاگی آئی ہو۔ اس سے ٹھیک سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔
میں ایک منٹ کے لیے بُری طرح گھبرا گیا۔ انجنا کے والدین نہ جانے کیا سوچ لیں۔ وہ لوگ بار بار میرے والدین سے نظریں ملا رہے تھے لیکن منی کی موجودگی میں کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔
منی مجھے کھینچے جا رہی تھی: "پلیز۔"
لاچار مجھے اُٹھ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں اس وقت کسی حد تک ڈرا ہوا تھا۔ انجنا کے والدین کے ناراض ہو جانے کا خدشہ تھا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا۔
"کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
منی نے میری طرف دیکھا اور بولی۔
"میری مدد کرو، میں آج کی رات تمھارے پاس ٹھیروں گی۔"
"میرے پاس!" ایک دم میرے منہ سے نکل گیا۔ مجھے اپنے اور انجنا کے والدین کا خیال تھا۔

" وہ شاید میرا خیال بھانپ گئی، بولی :

" میں تمھارے Parents سے کہہ دوں گی۔ تمھاری مدد سے اجازت لے لوں گی۔ وہ انکار نہیں کریں گی۔ تم اتنا نہیں کہو گے میں تمھاری فرینڈ ہوں! اس بات پر وہ لوگ مان جائیں گے۔ بس آج کی رات رہوں گی۔ دن چڑھتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

" لیکن منی . . ."

" میں تمھارے کمرے میں نہیں رہوں گی۔ یا ہو الا کوئی کمرہ دے دینا —— پلیز —— میری مدد کرو۔"

" تم سمجھتی نہیں ہو منی۔" میں اُسے انجنا اور اپنی شادی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں نہیں بتا سکا۔

" چلو، میں تمھارے ڈیڈی سے کہے دیتی ہوں۔ وہ یقین کرلیں گے کہ میرے تمھارے تعلقات ناجائز نہیں ہیں۔ وہ میری بات ضرور مان لیں گے۔ میں 'ہولی مدر' کی قسم کھا کر کہوں گی۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

" یہ بات نہیں منی۔" میں نے ایک بار پھر اسے موقع کی نزاکت سمجھانا چاہی، لیکن بات لبوں تک نہیں آسکی۔

" اچھا۔" اس نے نہایت مایوس اور درد بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ " میں سوچتی تھی —— خیر —— معاف کرنا، تمھیں خواہ مخواہ تکلیف دی آکر۔ اُن لوگوں سے بھی میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ خدا حافظ بھی تو نہیں کہہ سکا جواب میں۔

جب میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو والد صاحب نے قدرے خفگی سے پوچھا : " کون تھی ؟"

" میرے دوست آرتھر کی بہن۔ اُس کے بھائی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے، والدین باہر گئے ہوئے ہیں، وہ میرے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا۔

" اچھا، وہ آرتھر، لمبا چوڑا، جوان سا، وہ جو تیرے پاس آیا کرتا ہے۔" والدہ صاحبہ نے موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

میں اُن کی ذہانت اور موقع شناسی کا قایل ہو گیا۔

انجنا کے لکھ پتی باپ کے چہرے سے ایک دم جیسے ساری گرد ڈھل گئی۔

" بیچاری بہت پریشان تھی۔ مجھے کہتے، میں ایس۔ ایس۔ پی۔ کو فون کر دیتا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔

صبح سوسن کا فون آیا کہ منی نے رات گاڑی تلے آکر خودکشی کرلی۔ اُس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی میں ایک دم پتھر ہو کر رہ گیا۔ زبان سے افسوس کا ایک کلمہ بھی نہیں ادا کر سکا، جیسے کسی خونی جانور نے اپنے تیکھے، مضبوط پنجے میرے دل پر گاڑ دیے ہوں اور ہر لمحہ اُس کے تیز ناخن دل میں اُترتے چلے جا رہے ہوں۔

اب بھی جب کبھی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ تیز ناخن میرے دل میں اُترنے لگتے ہیں اور میں اُداس ہو جاتا ہوں۔